Regd. L. No.7243

Phone: 880800

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1980

946
24-5-87

عہد صدیقی میں "مانعین زکواۃ" کے خلاف جہاد

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماھنامہ لاھور

قیمت فی پرچہ	ٹیلی فون	بدلِ اشتراک
۳	۸۰۸۰۰	سالانہ
تین روپے	خط و کتابت	پاکستان ۔۔۔ ۳۶/- روپے
	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	غیر ممالک ۔۔۔ ۴/- پونڈ
شمارہ ۱۱	نومبر ۱۹۸۰ء	جلد ۳۳

فہرست

۱ - لمعات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲

— عہدِ صدیقی میں "مانعینِ زکوٰۃ" کے خلاف جہاد —

۲ - ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ ۔۔۔۔۔۔ ۱۰

— (محترم پرویز صاحب) —

۳ - حقائق و عبر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۳

(۱) تحریکِ پاکستان کی مخالفت (انگریز اور امریکہ)

(۲) لڑکی کو کتوں نے کھا لیا

(۳) ہماری انسانی برآمدات

(۴) بھارت کی اسلحہ کی دوڑ اور بھوک کا مسئلہ

(۵) ختمِ نبوت کی شہادات

(۶) جیلوں میں انصاف کی مٹی پلید

(۷) ہماری قسمت کے فیصلے؟

۴ - فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ۔۔۔۔ ۳۹

۵ - نقد و نظر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۱

(۱) دانائے راز - (۲) اشرف التفاسیر

۶ - قرآنِ مجید اور ۱۹ کے عدد کا چکر ۔۔۔۔۔۔ ۴۶

۷ - قرآنِ مجید کی حکمرانی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۰

— (حکیم محمد سعید صاحب) —

۸ - اسلامی نظامِ حکومت کے خط و خال ۔۔۔۔۔ ۵۴

۹ - قرآنی درس کے اعلانات ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۴

ایڈیٹر محمد خلیل - ناشر سراج الحق - مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور - مطبوعہ - اشرف پرنٹنگ پریس لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

عہدِ صدیقیؓ میں "مانعینِ زکوٰۃ" کے خلاف جہاد

زکوٰۃ کے سلسلہ میں ہمیں اکثر استفسارات موصول ہوتے ہیں جن میں دریافت کیا گیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں "مانعینِ زکوٰۃ" کے خلاف جو جہاد کیا گیا تھا اس کی تفصیل کیا ہے؟ اس سوال کا تعلق تاریخ سے ہے اور ظاہر ہے کہ ہم تاریخ ہی سے اس کا جواب دے سکیں گے۔ (ہماری تاریخ کی پوزیشن کیا ہے اس کے متعلق ہم آخر میں بیان کریں گے۔) اس تاریخی واقعہ تک پہنچنے سے پہلے ایک تمہید ضروری ہے جس سے اس واقعہ کا پس منظر سامنے آجائے گا۔

بعثتِ نبی اکرمؐ کے زمانے میں عرب کی حالت یہ تھی کہ اس کی آبادی کا قلیل سا حصہ شہروں میں بستا تھا اور اس کی کثیر تعداد ان بدوؤں پر مشتمل تھی جو صحراؤں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ انہیں اعراب کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ شہروں میں (جو گنتی کے چند تھے) حضورؐ کی ہجرت کے بعد، مدینہ منورہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ یہاں کے مسلمان وہ سعادت مند نفوس تھے جو حضورؐ کی تعلیم و تربیت اور قرب و حضورؐ سے مسلسل فیضیاب ہوتے رہے جس کی وجہ سے ان کے ایمان میں ایسی پختگی اور سیرت و کردار میں ایسی بلندی پیدا ہوگئی کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں "مومنِ حقاً" (پکے اور سچے مومن) کہہ کر پکارا۔ ان کے برعکس، اعراب کی جو کیفیت تھی اسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (۴۹/۱۴)

یہ صحرانشین بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اس لئے ہم مومنین کے زمرے میں شمار ہونگے۔

ان سے کہو کہ تم ابھی مومن کے درجہ پر نہیں پہنچے۔ تم نے اسلامی حکومت کی فرماں پذیری اختیار کی ہے۔ تمہارے دل کی گہرائیوں میں ابھی ایمان داخل نہیں ہوا۔ (بایں ہمہ) اگر تم اللہ اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی) کی اطاعت کرتے رہو گے تو تمہیں تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملتا جائے گا۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی۔ خدا کی حفاظت اور رحمت میں تم برابر کے شریک ہو گے۔[1]

یہ تھی عرب کے مسلمانوں کی کثیر آبادی کی حالت۔ ظاہر ہے کہ جب تک ان کی اطاعت پذیری اور خلوص کا پورا پورا امتحان نہ لے لیا جاتا، امورِ مملکت میں ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ جو تاریخ میں آتا ہے کہ جب حضورؐ کی وفات ہوئی تو حضرت عمرؓ نے مجمع سے کہا کہ اگر کسی کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ حضورؐ رحلت فرما گئے ہیں تو اس کی گردن اڑا دی جائے گی، تو اس میں یہی مصلحت پوشیدہ تھی۔ وہ چاہتے نہیں تھے کہ جب تک (حضورؐ کے بعد) سربراہِ مملکت کا تعین نہ ہو جائے، یہ خبر عام ہو جائے۔ اعراب پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ حضرت عمرؓ کا اندازہ صحیح تھا۔

حضورؐ نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری دنوں، شام کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے حضرت اسامہؓ بن زید کے زیرِ قیادت ایک لشکر مرتب فرمایا تھا۔ وہ ابھی روانہ نہیں ہوا تھا کہ حضورؐ کی وفات ہو گئی۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ نے اس لشکر کو روکنا نہ چاہا اور اسے روانہ کر دیا۔ اس کی روانگی کے بعد دارالخلافہ (مدینہ) فوج سے خالی ہو گیا۔ اعراب نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور مختلف قبائل میں بغاوت کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے۔ ان میں سے جو قبائل مدینہ کے گرد و نواح میں پھیلے ہوئے تھے، انہوں نے اس میں پہل کی اور ایک لشکر مرتب کر کے، مدینہ کے باہر ڈیرہ ڈال دیا۔ مصر کے نامور مؤرخ محمد حسین ہیکل (مرحوم) نے عہدِ صدیقی کی بڑی مفصل تاریخ لکھی ہے جس کا اردو ترجمہ مکتبہ جدید، لاہور نے شائع کیا تھا۔ یہ باغی قبائل کس قسم کے خیالات پھیلاتے تھے، انہیں ہیکل کے الفاظ میں سنیئے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ لوگ کہتے تھے کہ

> مہاجرین اور انصار، چونکہ خلافت کے بارے میں جھگڑا کر چکے ہیں اور رسول اللہ نے وفات سے قبل کسی شخص کی خلافت کے متعلق وصیت نہیں کی اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم اسلام پر قائم رہتے ہوئے اپنی خود مختاری کی حفاظت کریں اور ہمیں یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ انصار اور مہاجرین کی طرح ہم بھی اپنے میں سے کسی شخص کو اپنا امیر مقرر کر لیں جو ہمارے لئے جانشینِ رسول اللہ کی طرح ہو۔ (حضرت) ابوبکرؓ یا ان کے سوا کسی اور کی اطاعت کے متعلق نہ دین میں کوئی نص موجود ہے اور نہ کتاب اللہ سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے ہم پر صرف اس شخص کی اطاعت واجب ہے جسے ہم خود اپنا امر مقرر کریں..... رسول اللہ نے عرب کے متعدد شہروں کو اپنی زندگی ہی میں بڑی حد تک خود مختاری عطا

---

[1] ان میں سے جنہوں نے اس کا ثبوت دیا تھا قرآن کریم نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ (۹/۹۹) لیکن ان کی بیشتر آبادی کا وہی حال تھا جو آیت بالا میں مذکور ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ مذمت۔ قرآن نے انہیں منافق کہا ہے۔ (۹/۱۰۱) نز (۹/۱۲۰)۔

> فرما دی تھی۔ اب اگر آپ کی وفات کے بعد وہ مکمل خود مختاری چاہتے ہیں تو اس میں کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ ہونی چاہیئے۔ (ص ۱۴۲-۱۴۳)

اس سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصل مسئلہ کیا تھا؟ آجکل کی سیاسی اصطلاح میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ وہ مرکز سے قطع تعلق کر کے مکمل صوبجاتی خود مختاری چاہتے تھے۔ بلکہ، بالفاظ صحیح، وہ اپنی جداگانہ مملکت قائم کرنا چاہتے تھے۔ ہیکل (نیز طبری کی تاریخ) میں ہے کہ ان لوگوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور حضرت ابوبکرؓ کے سامنے اپنی شرائط پیش کر دیں۔ چونکہ وہ شرائط مملکت کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت کے مرادف تھیں، اس لئے کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ انہیں مسترد کر دیا گیا اور حضرت صدیق اکبرؓ نے اہلِ مدینہ کو جمع کر کے فرمایا۔

> تمہارے چاروں طرف دشمن ڈیرہ ڈالے پڑا ہے اور اسے تمہاری کمزوریوں کا علم ہو گیا ہے۔ نہ معلوم، دن اور رات کے کسی حصے میں وہ لوگ تم پر چڑھ آئیں۔ وہ تم سے ایک منزل کے فاصلے پر خیمہ زن ہیں۔ ابھی تک وہ اس امید میں تھے کہ شاید تم ان کی شرائط قبول کر لو گے۔ لیکن اب ہم نے ان کی شرائط ماننے سے انکار کر دیا ہے اس لئے وہ ضرور تم پر حملہ کرنے کی تیاریاں کریں گے۔ تم بھی اپنے آپ کو لڑائی کے لئے تیار رکھو۔ (ص ۱۸۸)

چنانچہ حکومت کی مجلسِ مشاورت میں یہ معاملہ زیرِ بحث آیا۔ اور ہنوز یہ بحث جاری تھی کہ باغیوں نے مدینہ پر حملہ کر دیا حتیٰ کہ (ابنِ خلدون، طبری اور دیگر مؤرخین کے بیان کے مطابق) ان قبائل کے جن مسلمانوں نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا، انہوں نے انہیں قتل کر دیا۔ اور یہی کچھ دیگر باغی قبائل نے بھی کیا۔ ان حالات میں ان کے خلاف جنگ لازم قرار پا گئی۔ اور حضرت صدیق اکبرؓ نے کمال عزیمت اور ہمت سے کام لے کر اس اٹھتے ہوئے فتنہ کو فرو کر کے پورے ملک میں امن قائم کر دیا۔ اس کے بعد کسی کو بغاوت کی جرأت نہ ہوئی۔ اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ یہ جہاد کیا تھا۔ کن لوگوں کے خلاف تھا اور اس کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ تاریخ میں اسے "مانعین زکوٰۃ" کے خلاف جہاد کیوں کہا گیا ہے؟ زکوٰۃ کا اس سے کیا تعلق تھا؟ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ یہ لوگ مرکزی حکومت سے قطع تعلق کر کے، اپنی آزاد حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کی عملی تشکل کا آغاز انہوں نے مرکزی حکومت کے واجبات روک لینے سے کیا تھا۔ تاریخ میں اسے "زکوٰۃ روک لینے" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہیکل لکھتا ہے۔

> زکوٰۃ کے بارے میں ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ اصل میں جزیہ ہے جو ان پر عائد کیا گیا ہے۔ حالانکہ جزیہ صرف غیر مسلموں پر واجب ہے۔ اس صورت میں کہ وہ ویسے ہی مسلمان ہیں جیسے مدینہ والے تو وہ کیوں حاکم مدینہ کو زکوٰۃ ادا کریں؟ ان کے اور اہلِ مدینہ کے درمیان صرف ایک قدر مشترک ہے، اور وہ ہے دینِ اسلام۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مدینہ والے ان پر حکومت کرنے کے بھی حق دار ہیں۔ اہلِ مدینہ کو بے شک اسلام میں اوّلیت کا شرف حاصل ہے لیکن دوسرے قبائل پر اپنی فضیلت کا اظہار وہ صرف اس صورت میں کر سکتے ہیں کہ وہ ان کی طرف معلمین بھیجیں جو انہیں دین کا علم سکھائیں، بالکل اسی طرح جیسے رسول اللہؐ کیا کرتے تھے۔ وہ اور ہم بے شک

> ایک ہی اُمت ہیں لیکن اس سے یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ کسی فریق کو دوسرے فریق پر غلبہ و تسلّط حاصل ہو اور ایک قبیلے کو اس کی آزادی اور خود مختاری کی نعمت سے محروم کر دیا جائے۔ (صفحہ ۴۵-۱۴۴)۔ ہیکل نے دوسری جگہ لکھا ہے کہ وہ حکومت کے ان واجبات کو تاوان کہہ کر پکارتے تھے۔ (صفحہ ۱۸۴)

اس سے ظاہر ہے کہ وہ اعراب (ایمان جن کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا تھا) اسلام کی بہ حیثیت ایک ہمہ گیر نظامِ مملکت کے تصوّر سے ناآشنا تھے۔ وہ اسے ایک "مذہب" ہی سمجھتے تھے۔ یہ وجہ تھی جو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا تھا کہ "واللہ، میں صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں فرق کرنے والے لوگوں سے ضرور لڑوں گا۔" (صفحہ ۱۸۶)

(-)

تصریحات بالا سے یہ واضح ہے کہ

(۱) یہ قبائل مرکزی حکومت کے ماتحت نہیں رہنا چاہتے تھے۔ خود مختار ہونا چاہتے تھے۔

(۲) اور اس خود مختاری (یا بغاوت) کا آغاز انہوں نے مرکزی حکومت کے واجبات ادا کرنے کے انکار سے کیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ تاریخ میں ان واجبات کو "زکوٰۃ" کہہ کر کیوں پکارا گیا ہے۔ اس سوال کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ دیکھئے کہ ہماری تاریخ کی حیثیت کیا ہے؟

(۱) یہ تاریخ حضورؐ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد مرتب ہوئی اور وہ بھی کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کی رُو سے نہیں بلکہ لوگوں سے سنی سنائی زبانی باتوں کی بناء پر۔ انہیں روایات کہتے ہیں۔ اس لئے جو کچھ اس تاریخ میں آیا ہے اس کی نہ کوئی تحریری سند ہے، نہ کوئی تحریری ماخذ۔ آپ خالص تاریخی معیار سے بھی دیکھیں تو اس قسم کی تاریخ قابلِ استناد قرار پا نہیں سکتی ــــ یہ مؤرخین اپنی تاریخ کا آغاز "حضرت آدم" سے کرتے ہیں۔ اور اس حد تک جزئیات میں چلے جاتے ہیں کہ (لکھتے ہیں کہ) ان کی پیدائش جمعہ کے دن ہوئی تھی اور جمعہ ہی کے دن وہ بہشت سے نکلے تھے۔ (وغیرہ وغیرہ) اسلام کے صدرِ اوّل کی تاریخ کے سلسلہ میں اس قسم کی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ میدانِ جنگ میں دو سپاہی نبرد آزمائی کے لئے باہر نکلتے ہیں۔ (اُس زمانے میں ایسی لڑائیاں بھی ہوتی تھیں) ایک دوسرے کے ساتھ کچھ باتیں کرتے ہیں۔ اور پھر دونوں قتل ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ باہمی گفتگو تاریخ میں پوری کی پوری درج ہوتی ہے۔ کوئی ان مؤرخین سے یہ نہیں پوچھتا نہ یہ خود ہی بتاتے ہیں کہ ان کی اس تاریخ کا ماخذ کیا ہے اور اس کی سند کیا۔ اور وہی تاریخ آگے نقل ہوتی چلی جاتی ہے۔

(۲) یہ تاریخ ایسے زمانے میں مرتب ہوئی جب عباسی ملوکیت اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ ملوکیت کا استبداد کس طرح حق گوئی کا گلا گھونٹ دیتا ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

کون مؤرّخ اس کی جرأت کر سکتا تھا کہ اُن سلاطین اور ان کے تخلیق کردہ معاشرہ میں جو کچھ ہو رہا تھا اُسے خلافِ اسلام قرار دے دیتا! اس کے برعکس، وہاں ہر ممکن کوشش اس کی ہوتی تھی کہ ان سلاطین کے فیصلوں اور اس معاشرہ کی روش کو عین مطابقِ اسلام ثابت کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے روایات وضع کی جاتیں تھی جو تاریخ کی کتابوں میں بھی بار پا جاتی تھیں اور احادیث کے مجموعوں میں بھی۔

اگر ہم تاریخ کو صرف تاریخ کی حد تک رکھیں اور سمجھ لیں کہ اس میں غلط اور صحیح۔ رطب اور یابس سب کچھ مخلوط ہے تو اس سے اسلام کو چنداں گزند نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن اگر اس تاریخ کو دین کے لئے سند قرار دے لیں تو پھر دین، دین نہیں رہ سکتا۔ دین کے لئے ضروری ہے کہ اس کی سند کا ایک ایک لفظ یقینی ہو۔ اور یہ خصوصیت صرف کتاب اللہ کو حاصل ہے جو مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ اور اس کے ایک ایک لفظ کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔

جہاں تک عہدِ رسالت مآب ؐ اور خلافتِ راشدہ کے دور کا تعلق ہے، ہمیں چاہیئے تھا کہ اس تاریخ کو قرآن مجید کی کسوٹی پر پرکھتے۔ جو واقعات اس کے مطابق ہوتے انہیں قبول کر لیتے، جو اس کے خلاف جاتے انہیں وضعی قرار دے کر مسترد کر دیتے۔ یہ اس لئے کہ (خود قرآن مجید کی شہادت کی رو سے) اُن حضرات کی زندگی قرآن کے قالب میں ڈھلی ہوئی تھی اور وہی ان کی سیرت کی تاریخ کا معیار قرار پا سکتا تھا۔ لیکن ہم نے ایسا نہ کیا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اس تاریخ سے خالص اسلامی نظام اور معاشرہ کا تصوّر ہی سامنے نہیں آتا۔ لیکن ہم ہیں کہ اسی کو معیار بنائے چلے آ رہے ہیں۔ اُمت میں جس قدر خلفشار اور انتشار پھیلا آتا ہے اس کی بیشتر وجہ یہی غیر منقح تاریخ ہے۔

زیرِ نظر واقعہ (جہاد) کے متعلق تاریخ میں اتنا ہی لکھا ملتا ہے کہ ان لوگوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس میں تفصیل سے نہیں بتایا گیا کہ "زکوٰۃ" سے مفہوم کیا تھا؟ انہوں نے کس چیز کی ادائیگی سے انکار کیا تھا؟ چونکہ اس میں اس کی بابت کچھ نہیں کہا گیا اس لئے ہمارا ذہن لامحالہ زکوٰۃ کے اسی مفہوم کی طرف منتقل ہوتا ہے جو ہمارے ہاں مروّج ہے۔ لیکن جب ہم قرآن مجید کے آئینے میں دیکھتے ہیں تو زکوٰۃ کا مختلف مفہوم ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کے متعلق ہم اس سے پہلے بڑی تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ یہاں اسے مختصر الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے ایک نظر قرآن کے معاشی نظام پر ڈال لینا ضروری ہے۔ قرآن کے معاشی نظام کے بنیادی عناصر حسبِ ذیل ہیں:-

۱۔ تمام افرادِ معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری نظامِ مملکت پر عائد ہوتی ہے۔ رزق میں سامانِ پرورش بھی آ جاتا ہے اور ذرائع نشوونما بھی۔ "نشوونما" کو عربی زبان میں "زکوٰۃ" کہتے ہیں۔

۲۔ اس نظام میں ہر فرد (بجز ان کے جو کسی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہیں) اپنی استعداد کے مطابق پوری پوری محنت سے کام کرتا ہے۔ اور اس محنت کے ماحصل میں سے یا تو اپنے رزق کے لئے خود رکھ لیتا ہے اور باقی سارے کا سارا نظام کی تحویل میں دے دیتا ہے تاکہ وہ اس سے افرادِ معاشرہ کو رزق اور سامانِ نشوونما پہنچانے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اور یا سارے کا سارا نظام کو دے

دیتا ہے اور وہ نظام اسے بھی، دیگر افراد کے ساتھ سامانِ رزق مہیا کر دیتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں زر جمع کرنے۔ زمینیں خریدنے اور جائدادیں کھڑی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۙ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹) "یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کے لئے دے دیں۔ ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے، وہ سب"

۳۔ قرآن کریم نے نظامِ مملکت کی اس ذمہ داری کو "ایتاءِ زکوٰۃ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ اس لئے اس نے جماعتِ مومنین کے متعلق کہا ہے کہ "جب انہیں حکومت ملے گی تو وہ ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے"۔ (۲۲/۴۱)۔ اس نے دوسری جگہ اس جماعت کے متعلق کہا ہے۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ۔ (۲۳/۴) "وہ زکوٰۃ کی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے مصروفِ عمل رہتے ہیں"۔ لِلزَّكٰوةِ (زکوٰۃ کے لئے۔ یعنی افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما مہیا کرنے کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے) مصروفِ کار رہتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما مہیا کرے۔ نشوونمائیں تمام انسانی صلاحیتوں کی برومندی شامل ہے۔

آپ سوچئے کہ بنی عباس (یا کسی اور دور) کی ملوکیت کسی صورت میں بھی اس معاشی نظام کو اپنا سکتی تھی؟ ملوکیت تو چلتی ہی نظامِ سرمایہ داری کے سرپر ہے۔ اس لئے اس دور میں زکوٰۃ، کا قرآنی مفہوم بار ہی نہیں پا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ مفہوم نظامِ سرمایہ داری کو جڑ سے کاٹ دیتا تھا۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اس اصطلاح کو ایسے معانی پہنائے جائیں جو اس نظام میں فٹ بیٹھ جائیں۔ اصل یہ ہے کہ ہمارا مروجہ اسلام عہدِ ملوکیت کا وضع کردہ ہے جس میں الفاظ اور اصطلاحات تو قرآن کی ہیں لیکن ان کا مفہوم وہ ہے جو نظامِ ملوکیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس کے لئے وجہِ جواز یہ بتائی تھی کہ اس سے ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ اسلام سے اس ٹھپہ کو مٹا سکیں جو عہدِ ملوکیت نے اس پر لگا دیا تھا، تو اس سے ان کی یہی مراد تھی۔

بنا بریں ہمیں اپنی تاریخ پر دین کی بنیاد نہیں رکھنی چاہیئے۔ نہ ہی اس کی رُو سے دین کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ دین ہے بھی قرآن کے اندر اور سمجھا بھی اسی کی رُو سے جا سکتا ہے۔ اس سے باہر جو کچھ ہے اگر وہ اس کی تائید کرتا ہے تو قابلِ تسلیم ہے، ورنہ ناقابلِ اعتناء۔

(۰)

اگر عہدِ صدیقیؓ کے واقعہ میں "مانعینِ زکوٰۃ" کے الفاظ فی الواقعہ استعمال ہوئے تھے تو اس کی ایک ہی توجیہہ سمجھ میں آتی ہے۔ آجکل مملکتوں کا اقتصادی ڈھانچہ کچھ اس قسم کا ہے کہ آمدنی کی کچھ مدات مرکز کے لئے مختص ہوتی ہیں اور باقی مدات صوبوں کے لئے کھلی رہتی ہیں۔ مرکز اپنی آمدنی وصول یا جمع کرنے کے لئے اپنا انتظام کرتا ہے۔ کبھی کبھی تنازعہ اس بات پر پیدا ہو جاتا ہے کہ فلاں مد مرکز کی ہے یا صوبے کی۔ اسلام کے صدرِ اوّل میں یہ نظام کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مختلف علاقے (جنہیں بعد میں ولایات کہا گیا) ساری آمدنی خود وصول کرتے تھے اور اس میں سے اپنا حصہ رکھ کر، مرکز کا حصہ مرکز کو بھیج دیتے تھے۔ چونکہ اس

آمدنی کا بنیادی مقصد "ایتائے زکوٰۃ" تھا اس لئے اسے بغرض تفہیم "زکوٰۃ" کہہ کر پکارتے ہوں گے۔ ان باغی قبائل نے کہا کہ ہم اپنے علاقے کی ساری آمدنی خود رکھیں گے۔ مرکز کو کچھ نہیں بھیجیں گے۔

ان کے اس طرزِ عمل کے خلاف حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ جب تک میں ان سے عقالؔ یعنی اونٹ کی وہ رسّی بھی وصول نہیں کر لوں گا جو حکومت کے واجبات میں سے ہے، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ یہ اس لئے کہ ان قبائل کا یہ موقف مرکز کے خلاف بغاوت کے مرادف تھا اس لئے اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اور جب وہ اس کے لئے ہتھیار لے کر اٹھ کھڑے ہوئے تو انہیں تلوار کے زور سے روکنا پڑا۔ یہ تھا "مانعین زکوٰۃ" کے خلاف جہاد! بہرحال، صورت کچھ بھی تھی، وہ مملکت کے خلاف بغاوت تھی جس کا تدارک کرنا ضروری تھا۔ مملکت کے تو کسی معمولی سے معمولی قانون کے خلاف سرکشی کو بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ قبائل اپنی آزاد حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔

ضمناً "تاریخ میں ان لوگوں کو "مرتدین" بھی کہا گیا ہے۔ ہمارے ہاں آجکل مرتد سے مراد لی جاتی ہے، وہ شخص جو اسلام چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرلے اور اس کی سزا بتائی جاتی ہے، قتل۔ حتیٰ کہ وہ بھی جس کے خلاف کفر کا فتویٰ لگا دیا جائے۔ لیکن اس زمانے میں، مرتد کہتے تھے، رجل خرج من الاسلام فیحارب اللہ عزوجل ورسولہٗ (رواہ نسائی)۔ "جو شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہو کر خدا اور رسولؐ کے خلاف جنگ کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو"۔ لہٰذا، مرتد کا جرم، خدا اور رسولؐ (اسلامی مملکت) کے خلاف جنگ تھا، نہ کہ مذہب تبدیل کرنا۔ اسی جنگ کی وجہ سے ان باغیوں کو مرتدین کہا گیا تھا۔ انہوں نے تو اسلام کو چھوڑا بھی نہیں تھا۔ مرتد سے مراد، اسلامی مملکت کے خلاف سرکشی اختیار کرنے والا (یعنی باغی) تھا۔ بغاوت کی سزا تو قتل ہونی چاہیئے۔

ؔ فقہا نے اس پر بھی بڑی بحثیں کی ہیں کہ "عقال" ان چیزوں میں شامل ہو سکتی ہے یا نہیں جن پر (فقہی) زکوٰۃ واجب ہے۔ قرآنی "زکوٰۃ" میں اس قسم کے مسائل پیدا ہی نہیں ہوتے۔

نظامِ ربوبیت

آپ ایک عرصہ سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟

(یہ پہلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے!)

مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے۔

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے۔ کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ تینوں ناکام ہو گئے ہیں اور ان کے برعکس (۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسانی کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے ——— اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

✱ کتاب آفسٹ کی چھپائی میں ولائتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے ——— صفحات سوا پانچ سو صفحات ——— سنہری جلد ——— قیمت فی جلد پچاس روپے محصول ڈاک

مصنف کی دیگر شہرۂ آفاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ میں آسکتا ہے

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے، اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت:- فی جلد -/۴۰ روپے
مکمل سیٹ -/۱۵۰ روپے

تبویب القرآن

آپ کے ذہن میں کوئی سوال کھٹکتا ہے اور آپ معلوم کرنا چاہیں کہ اس کی بابت قرآن مجید میں کیا اور کہاں کہاں آیا ہے، تو اس کتاب سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا۔

اس کتاب میں قریب دو ہزار چار سو عنوانات ہیں اور ہر عنوان کے تحت اُن قرآنی آیات کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں اس کے متعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ کچھ کہا گیا ہے۔ مصنف کی چالیس سالہ تحقیق کا ماحصل ہے۔ کتاب بڑے سائز کے ۵۱۲ صفحات پر مشتمل ہے عمدہ سفید کاغذ، اوفسٹ کی چھپائی۔ تین مضبوط اور دیدہ زیب جلدوں میں۔ قیمت:- مکمل سیٹ -/۱۷۵ روپے

مفہوم القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھ میں نہیں آسکتا، یہ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رُو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے (مع متن) عمدہ دبیز کاغذ پر تین مطلا جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ قیمت:- فی جلد -/۵۰ روپے
مکمل سیٹ جلد -/۱۵۰ روپے

مطالب الفرقان

پرویز صاحب کے درسِ قرآن مجید کا سلسلہ گزشتہ بیس سال سے جاری ہے۔ اس میں ان کا انداز یہ ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت کے محاورۂ عرب اور تصریف آیاتِ قرآنی سے آیاتِ قرآنی کی جدید دور کے تقاضوں کے مطابق مسلسل تشریح کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ان درسوں کی بنیاد پر قرآن کریم کی تفسیر مرتب کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کا نام مطالب الفرقان ہے ابھی تک اس کی دو جلدیں شائع ہوئی ہیں۔
عمدہ سفید کاغذ، پاکیزہ اوفسٹ چھپائی۔
قیمت:- جلد اوّل -/۵۰ روپے، جلد دوم -/۵۰ روپے، جلد سوم -/۷۵ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام بی/۲۵ گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ

پرویز

(پرویز صاحب کا یہ خطاب طلوع اسلام کنونشن بابت ۱۹۷۷ء میں پیش کیا گیا تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ناسازگار حالات کی وجہ سے گزشتہ تین سال سے طلوع اسلام کا سالانہ کنونشن منعقد نہیں ہو سکا جس کی وجہ سے ہم پرویز صاحب کے ایسے اہم خطابات سے محروم ہو گئے ہیں۔ طلوع اسلام کے حلقۂ قارئین میں نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا تقاضا ہوتا ہے کہ سابقہ اہم خطابات سے انہیں استفادہ کا موقعہ دیا جائے۔ اس بنا پر ہم وقتاً فوقتاً یہ خطابات شائع کرتے رہتے ہیں۔ ویسے بھی یہ خطابات، اُن حقائق پر مبنی ہوتے ہیں جو فرسودہ نہیں ہوتے۔ اس لئے ان خطابات کی تجدید تحصیلِ حاصل نہیں ہوتی۔ اس سے تجدید یادداشت ہو جاتی ہے)

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر۔ سلام و رحمت

جیسا کہ آپ نے پروگرام سے دیکھ لیا ہوگا، میرے آج کے خطاب کا عنوان ہے:-

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ

میں سمجھتا ہوں کہ آپ میں سے اکثر احباب کو یہ عنوان کچھ عجیب سا دکھائی دے گا لیکن اس سے کہیں زیادہ عجیب ہوں گے وہ حقائق جو اس عنوان کے تابع آپ کے سامنے آئیں گے اور اس کے بعد عجب ان عجائبات پر ہنستے ہنستے پردے اٹھیں گے تو عجیب تر حقیقتیں بے نقاب ہوں گی۔ ہم صبح سے شام تک سینکڑوں الفاظ بلا تکلف بولتے اور بیسیوں اصطلاحات بلا تامل استعمال کرتے ہیں لیکن اگر ہم کبھی سوچنے بیٹھیں تو یہ عجیب حقیقت ہمارے سامنے آئے گی کہ ان میں سے بیشتر کا کوئی متعین مفہوم ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا۔ اگر ان الفاظ و اصطلاحات کا دائرہ ہماری روزمرہ کی نجی زندگی تک محدود رہے تو اس سے کچھ زیادہ حرج واقع نہیں ہوتا لیکن جب ان کا تعلق زندگی کے اجتماعی مسائل سے ہو تو اس کے نتائج بڑے دُور رس اور عواقب بڑے مضرت رساں ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ذرا اس حقیقت پر غور فرمائیے کہ آج، دنیا میں قریب ستر کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ ہم ساری دُنیا کو سامنے نہ بھی رکھیں تو بھی صرف اس حصۂ پاکستان میں قریب چھ کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن اگر آپ ان میں سے کسی سے پوچھیں کہ مسلمان کہتے کسے ہیں تو اوّل تو وہ کوئی متعین جواب دے نہیں سکے گا، اور اگر کوئی جواب دے گا، تو ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملے گا۔ یہ عوام تک ہی محدود نہیں۔ اس میں ہمارے مذہب کے اجارہ دار؛ علماء کرام بھی برابر کے شریک ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب ۱۹۵۳ء کے فسادات پنجاب کے سلسلہ میں تحقیقات کے لئے منیر کمیٹی قائم ہوئی تھی تو انہوں نے ملک کے بلند پایہ علماء سے یہی سوال پوچھا تھا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ اس کے جواب میں اکثر و بیشتر نے تو اتنا کہہ کر پیچھا چھڑا لیا کہ یہ سوال ایسا نہیں جس کا جواب ارتجالاً دیا جا سکے۔ اس کے لئے خاصا نوٹس چاہیئے، اور جن حضرات نے جواب دیا ان میں سے کسی ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملتا تھا، اس کے بعد ان علماء کی طرف سے یہ مطالبہ تو مسلسل ہوتا رہا کہ آئین میں یہ شق درج ہونی چاہیئے کہ مملکت کے صدر کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے لیکن مسلمان کی تعریف (DEFINITION) متعین

کرنے سے ہر ایک گریز کرتا رہا۔ ازاں بعد ۱۹۷۲ء میں ایک بار مرکزی اسمبلی کے ایوان میں پھر یہ سوال اٹھایا گیا تو اس کا جواب، سارے ملک کے علمائے کرام میں سے صرف ایک (صاحب) نے دیا، اور جو، جواب انہوں نے دیا اس کی مخالفت چاروں طرف سے ہونی شروع ہو گئی۔ ممکن ہے آپ کہہ دیں کہ اس سوال کا جواب آسان ہے یعنی مسلمان اسے کہتے ہیں جو اسلام کا ماننے والا ہو۔ لیکن جب آپ سے پوچھا جائے کہ اسلام کسے کہتے ہیں تو آپ کے ذہن کی گاڑی پھر رک جائے گی۔ اس کا آپ کے پاس کوئی متعین جواب نہیں ہوگا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ اس سے آپ عزیزانِ من! اندازہ لگائیے کہ یہ امر کس قدر باعثِ تعجب اور وجۂ حیرت ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان متفقہ طور پر یہ بھی نہ بتا سکیں کہ اسلام کسے کہتے ہیں اور مسلمان کی تعریف کیا ہے! اور یہیں سے یہ حقیقت بھی سمجھ میں آجائے گی کہ مسلمان کی اس ستر کروڑ آبادی میں جو اس قدر تشتت و افتراق، اس قدر انتشار و خلفشار، اس قدر تنازعات و اختلافات، اس قدر فقدانِ وحدت و عدمِ اتحاد ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں فکری وحدت نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ؎

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

ہم میں سے عوام نے (کہ جنہیں آپ جمہور مسلمان یا اُمت کا گروہِ عظیم و کثیر کہہ لیجئے) تو کبھی سوچا ہی نہیں کہ جب ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ لیکن جنہیں خواص (یا طبقۂ علماء) کہا جاتا ہے انہوں نے بھی سوچا ہے تو ان میں سے ہر ایک کی سوچ ان کے اپنے فرقہ کے "چاہِ زمزم" میں گھر کر رہ گئی ہے۔ یعنی وہ حضرات اتنا تو شاید بتا سکیں کہ سُنّی کسے کہتے ہیں اور شیعہ کسے۔ پھر سنیوں میں اہلِ حدیث کسے کہتے ہیں اور اہلِ فقہ کسے۔ پھر اہلِ فقہ میں سے حنفی کسے کہتے ہیں اور شافعی کسے۔ مالکی کسے کہتے ہیں اور حنبلی کسے۔ دیوبندی کسے کہتے ہیں اور بریلوی کسے۔ لیکن ان میں سے متعین طور پر کوئی نہیں بتا سکے گا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں اور اسلام کیا ہے؟

پروفیسر وائٹ ہیڈ نے کہا ہے کہ اگر کسی پرابلم کو (DEFINE) کر دیا جائے تو اس سے آدھا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ اس بناء پر میں یہ عرض کروں گا کہ اگر آج کوئی صاحبِ درد، اس اُمتِ منتشرہ میں وحدت پیدا کرنے کے لئے اٹھے تو اس کے لئے سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہوگا کہ وہ اس اسلام کا بنیادی مفہوم متعین کرے جس کی طرف یہ اُمت اپنے آپ کو (لفظاً ہی سہی) منسوب کرتی ہے۔ اس کے سوا، مسلمانوں میں وحدت تو ایک طرف، اتحاد پیدا کرنے کی بھی کوئی صورت ممکن نہیں۔ وحدتِ فکر وہ بنیاد ہے جس پر وحدتِ عمل کی عمارت استوار ہوتی ہے اور اسی وحدتِ فکر و عمل کا نام امت کی وحدت ہے۔ میں۔ برادرانِ گرامی قدر! قرآن کریم کا طالب علم ہوں۔ میں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اس کتابِ عظیم کی روشنی میں، اپنی بصیرت کے مطابق، اسلام کے بنیادی تصورات کا مفہوم متعین کرنے میں صرف کیا ہے اور میری اس کوشش کا ماحصل میری تصانیف کے اوراق میں محفوظ ہے ـــــ بالخصوص لغات القرآن میں۔ میں آج کی نشست میں آپ احباب کے سامنے، ان میں سے چند ایک اہم تصورات کا مفہوم پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے نہ کسی سیاسی جماعت سے۔ اس لئے میرے پیش کردہ مفاہیم کی بنیاد، قرآن کریم ہے نہ کہ کسی خاص فرقہ کے معتقدات۔ اگر آپ

احباب ان مفاہیم سے متفق ہوں تو بہ المراد۔ لیکن اگر آپ کو ان سے اختلاف ہو، تو میں کسی کو مجبور نہیں کروں گا کہ وہ انہیں ضرور صحیح تسلیم کرے۔ لیکن اتنا پھر بھی کہوں گا کہ جب تک دین کے بنیادی تصورات کا متفق علیہ مفہوم متعین نہیں ہوتا، اُمت میں وحدت پیدا نہیں ہو سکتی۔ امتوں کی وحدت، ان کے افراد کے قلب و نظر کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

چیست ملت ایکہ گوئی لا الٰہ؟
با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

اور یہ "با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ" اسی صورت میں ممکن ہے جب تمام افرادِ ملت کے سامنے دین کے تصورات کا متفق علیہ متعین مفہوم ہو۔

ان تمہیدی گذارشات کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

۱۔ اسلام

سب سے پہلے ہم اسلام کو لیتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے کہ کائنات کی ہر شے اُس قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہے جو اُس کے لئے تجویز کیا گیا ہے : لَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳/۸۳)۔ اسی لفظ اَسْلَمَ سے اسلام ہے۔ یعنی کسی کے سامنے جھکنا، سرِ تسلیم خم کرنا۔ دوسری جگہ اسے لفظ سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۳/۱۵)۔ "کائنات میں جو کچھ ہے قوانینِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے"۔ اشیائے کائنات کا اس طرح قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنا، ان کے اختیار و ارادے سے نہیں۔ انہیں اختیار و ارادہ دیا ہی نہیں گیا۔ وہ ان کی اطاعت کے لئے مجبور ہیں۔ انہیں ان قوانین سے مجالِ سرکشی نہیں، یا رائے سرتابی نہیں۔ سورۂ نحل میں ہے: وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (۱۶/۴۹)۔ "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے" — وہ جاندار اشیاء ہوں یا مظاہرِ فطرت — "سب قوانینِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور ان سے کبھی سرکشی نہیں برتتے"۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۵۰) "جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے وہ اس کی تعمیل کئے جاتے ہیں"۔ ان کی اس روشِ زندگی کو اسلام کہا گیا ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کی اطاعت۔ یکسر اطاعت۔ بلا کم و کاست اطاعت۔

۲۔ الاسلام

اشیائے کائنات کی تو یہ کیفیت ہے کہ وہ "سب کی سب" ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کئے جا رہی ہیں جو ان کے لئے تجویز کئے گئے ہیں کیونکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن انسان کو صاحبِ اختیار پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کا جی چاہے تو ان قوانین کی اطاعت اختیار کرے، اور جی چاہے ان کی خلاف ورزی کرے۔ ان قوانین کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ یہ وہی قوانین ہیں جن کا اطلاق دیگر حیوانات پر بھی ہوتا ہے۔ اگر انسان

ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو اس سے اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ تندرست و توانا رہتا ہے۔ اس کے طبعی جسم کی کیفیت خوشگوار ہوتی ہے لیکن اس میں شرفِ انسانیت کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ یہ قوانینِ فطرت کے دوسرے قوانین کی طرح، علومِ سائنس کے ذریعے دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر قوانین صدیوں سے دریافت شدہ چلے آرہے ہیں۔ باقی ایسے ہیں جن میں نئے نئے سائنٹیفک انکشافات ہوتے رہتے ہیں۔

دوسری قسم کے قوانین وہ ہیں جن کا تعلق انسان کی ذات کی نشوونما، اور اس کی تمدنی زندگی کے نظم و ضبط سے ہے۔ یہ قوانین اسے وحی کے ذریعے ملے ہیں اور اب قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ انسان کا ان قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا، الاسلام کہلاتا ہے۔ طبیعی زندگی سے متعلق قوانین کی اطاعت تو انفرادی طور پر کی جا سکتی ہے اور کی جاتی ہے، لیکن ان قوانین کا اتباع ایک نظام کے تابع ہی ممکن ہے۔ نظام کے لئے قرآنِ کریم میں دین کا لفظ آیا ہے۔ یہ لفظ، ہر نظامِ حیات کے لئے بولا جا سکتا ہے، لیکن جب الاسلام کو نظامِ حیات کے طور پر اختیار کیا جائے تو اُس وقت یہ لفظ (INDEFINITE) سے (DEFINITE) ہو جائے گا اور الدّین کہلائے گا، اسی لئے قرآن میں ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳/۱۹)۔ الدّین اللہ کے نزدیک الاسلام ہی ہے۔ دوسری جگہ اس کی وضاحت ان الفاظ سے کر دی کہ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ (۳/۸۵)۔ جو شخص الاسلام کے علاوہ کوئی اور دین (نظامِ حیات) تلاش اور اختیار کرے گا، تو میزانِ خداوندی میں وہ قابلِ قبول نہیں ہوگا، اور وہ دیکھ لے گا کہ آخر الامر وہ کس قدر خسارے میں رہتا ہے۔

۳۔ اَلدِّیْن

میں نے ابھی کہا ہے کہ الاسلام پر انفرادی طور پر عمل پیرا نہیں ہوا جا سکتا، اجتماعی طور پر ہی ہوا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک نظامِ حیات کے تابع جسے الدّین کہہ کر پکارا گیا ہے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے نظامِ مملکت کہا جاتا ہے۔ قرآن میں قوانینِ حکومت یا نظامِ مملکت کے لئے، یہی لفظ آیا ہے۔ مثلاً سورۂ یوسفؑ میں ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنے بھائی (بن یامین) کو اپنے پاس روک لینا چاہتے تھے لیکن مَا کَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاہُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِکِ (۱۲/۷۶)۔ وہ، وہاں کے بادشاہ کے قانونِ حکومت کی رُو سے ایسا کر نہیں سکتے تھے۔ یہاں دین کا لفظ قانونِ حکومت کے لئے آیا ہے۔ سورۂ النّور میں زانی اور زانیہ کی سزا کا حکم آیا ہے جس کے ساتھ کہا گیا ہے کہ یہ سزا جماعتِ مومنین کی موجودگی میں دی جائے وَلَا تَاْخُذْکُمْ بِھِمَا رَاْفَۃٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ (۲۴/۲)۔ اور تم دین اللہ کے معاملہ میں قطعاً نرمی نہ برتو۔ یہاں ضابطہ تعزیرات کے لئے دین اللہ کی اصطلاح آئی ہے۔ یہی دین اللہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ، یاد رکھو! حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی اطاعت اور محکومیت اختیار نہ کی جائے: ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (۱۲/۴۰)۔ یہی نظامِ مملکت سب سے محکم ہے۔ اس نظامِ خداوندی (دِیْنُ اللّٰہِ) کے تمکن اور استحکام کے لئے اپنی مملکت کا وجود لاینفک ہے۔ سورۃ النّور میں ہے: وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ۔ تم میں سے جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور

ان کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں خدا نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں اُسی طرح ملک میں حکومت عطا کر دے گا جس طرح اِسی قسم کی قوموں کو ان سے پہلے حکومت عطا ہوتی رہی ہے۔ اس حکومت کا مقصد کیا ہوگا! فرمایا: وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ (۲۴/۵۵)۔ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ "اس سے اُس دین کو تمکن حاصل ہو جائے جسے خدا نے ان کے لئے پسند کیا ہے"۔

اس سے واضح ہے کہ اپنی آزاد مملکت کے بغیر الاسلام پر عمل پیرا ہونا ناممکن ہے۔

۴۔ مذہب

جب اپنی مملکت نہ ہو، یا مملکت تو ہو لیکن اس میں الاسلام کو بطور نظامِ حیات اختیار نہ کیا گیا ہو، تو اس صورت میں اسلام، دین نہیں رہتا، (عام اصطلاح میں) مذہب بن جاتا ہے۔ مذہب کا لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا اس لئے کہ الاسلام میں مذہب کا تصور ہی نہیں۔ مذہب میں اسلام یا دین سے مفہوم لیا جاتا ہے خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق جسے پوجا پاٹ، پرستش بندگی، یا دیگر رسوم و مناسک کی ادائیگی کے ذریعے قائم کیا جاتا ہے۔ اس وابستگی کا تعلق محض عقیدہ سے ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ اس کی حقیقت کچھ نہیں ہو سکتی۔ مذہبی پیشوائیت، دین کے اس پیکرِ بے روح اور جسدِ بے جان کو قائم رکھتی ہے کیونکہ اس سے ان کے مفاد وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ محض فریبِ تخیل ہوتا ہے جو حقائق کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ یہ دین کی ممی شدہ لاش ہوتی ہے جسے مردہ پرست ذہنیتیں تقدس کے تابوتوں میں محفوظ رکھتی ہیں۔ مذہب کے لئے چونکہ اپنی مملکت کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لئے یہ ہر مملکت اور ہر حکومت میں پنپتا رہتا ہے اور حکومتیں (بالعموم) اس کی آبادی دے دیتی ہیں۔ ہمیں انگریز کی حکومت میں بھی مذہبی آزادی حاصل تھی اور اب ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ لیکن کوئی حکومت دین کی آزادی نہیں دے سکتی کیونکہ دین تو اپنی آزاد مملکت قائم کرتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں کی نگاہوں سے دین کا تصور صدیوں سے اوجھل ہو چکا ہے اس لئے یہ بھی دیگر اہلِ مذاہب کے تتبع میں اسلام کو مذہب کہہ کر پکارتے ہیں اور انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ (RELIGION) کرتے ہیں۔ اسلام، بحیثیت الدین کے اس وقت دنیا میں کہیں بھی نہیں۔ ہر جگہ (خواہ وہ مسلمانوں کی اپنی سلطنتیں ہوں یا مسلمان، غیر مسلموں کے زیرِ حکومت رہتے ہوں) یہ مذہب کی شکل میں موجود ہے۔

۵۔ مسلمان

اب ہم اُس لفظ کی طرف آتے ہیں جو (جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے) استعمال کے لحاظ سے، دُنیا کے ہر گوشے میں، بیک وقت، کروڑوں زبانوں پر ہوتا ہے۔ لیکن مفہوم کے اعتبار سے جس کی یہ کیفیت ہے کہ کوئی دو ذہن بھی اس کی متفق علیہ (DEFINITION) متعین نہیں کر سکتے۔ وہ لفظ ہے مسلمان۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اس شکل میں نہیں آیا۔ اس کی جگہ اس میں مسلم کا لفظ آیا ہے جس کی جمع مسلمون اور مسلمین آتی ہے معنوی لحاظ سے مسلم سے مراد ہوگی قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والا۔ یعنی الاسلام کا پیرو۔ لیکن اس کا یہ مفہوم تو

اَلَّذِیْنَ کی رُو سے ہوگا جس میں اسلام کو بطور نظامِ حیات اختیار کیا جائے گا۔ مذہب میں چونکہ خود اسلام کا مفہوم ہی متعین نہیں، اس لئے مسلمان کا مفہوم کس طرح متعین ہو سکتا ہے؟ یہ وجہ ہے جو ہمارے علمائے کرام مسلمان کی کوئی متفق علیہ تعریف نہیں پیش کر سکتے۔

۶۔ ایمان

قرآن کریم کی ایک اہم بنیادی اصطلاح ایمان ہے۔ مذہب میں پہنچ کر ایمان کے معنی (FAITH) کے ہو جاتے ہیں جس سے مراد ہوتی ہے مذہبی مسلمات کو بلا دلیل و برہان اور بغیر علم و بصیرت، آنکھیں بند کر کے مان لینا۔ لیکن دین میں اس کا مطلب ہوتا ہے وحی کی عطا کردہ اقدار و اصول و احکام کو علیٰ وجہ البصیرت، دل اور دماغ کے کامل اطمینان اور سکون کے ساتھ حقیقت تسلیم کرنا۔ غور و فکر اور دلیل و برہان کے بغیر کسی بات کے تسلیم کر لینے کو قرآن، ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ چنانچہ قرآن کریم میں مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا (۲۵/۷۳) ۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ (اور تو اور) جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو یہ انہیں بھی اندھے، بہرے بن کر تسلیم نہیں کرتے۔ قرآن کریم اپنے ہر دعوے کو دلائل و براہین کی رو سے پیش کرتا ہے اور اپنے مخالفین سے بھی یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲/۱۱۱) اس کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو۔ ایمان کے متعلق اس قرآنی صراحت سے واضح ہے کہ

(۱) کوئی شخص جبر و اکراہ سے مومن نہیں بن سکتا، خواہ جبر و اکراہ کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

(۲) کوئی شخص تقلیداً مومن نہیں ہو سکتا کیونکہ تقلید میں کسی مسلک کو علم و بصیرت کی رُو سے اختیار نہیں کیا جاتا۔ اور

(۳) نہ ہی کوئی شخص پیدائشی طور پر مومن ہو سکتا ہے۔

لیکن علم و بصیرت کی رُو سے ابدی صداقتوں کو تسلیم کر لینا بھی مقصود بالذات نہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ انسان ان صداقتوں کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ ہر جگہ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی شرط لازمی کی ہے۔ یعنی ایمان کے بعد، اس کے مطابق عمل کرنے سے مقصد حاصل ہو سکتا ہے، خالی ایمان سے نہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مسلم ہونا، ہر مومن کی لازمی خصوصیت ہے یعنی ہر مومن کو مسلم (یعنی قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکا ہوا) ہونا چاہیئے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے قرآن کریم نے مسلم اور مومن کے الفاظ مرادف المعنی بھی استعمال کئے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے ایک اور بات بھی کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کو، دین کی صداقتوں کے متعلق، قلب و دماغ کا اطمینان تو ہنوز حاصل نہ ہوا ہو لیکن وہ اسلامی نظام کو کسی اور وجہ سے اختیار کر لے ـــــ "اور وجہ" سے مراد جبر و اکراہ نہیں ـــــ مثلاً جب مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہوئی اور اس کے انسانیت ساز نتائج ظہور میں آنے لگے، تو یہ چیز، گرد و نواح کے بدوی قبائل کے لئے وجہ کشش

بن گئی اور اس طرح وہ بھی اسلامی نظام مملکت میں داخل ہو گئے اس میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے بزعم خویش "سمجھ لیا کہ وہ مومن ہو گئے ہیں لیکن قرآن کریم نے انہیں اس پر متنبہ کیا اور کہا کہ تمہاری کیفیت ہنوز مؤمنین کی سی نہیں ہے۔ سورۂ حجرات میں ہے۔ قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا "یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لائے ہیں": قُل لَّمْ تُؤْمِنُوا۔ "ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے": وَلَٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا۔ "انہیں یہ کہنا چاہیئے کہ ہم نے اس نظام کو تسلیم کر لیا ہے۔ ہم اس کے سامنے جھک گئے ہیں": وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ "ایمان تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا"۔ بایں ہمہ انہیں اطمینان دلاؤ کہ إِن تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُم مِّنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا (۴۹/۱۴)۔ "اگر تم نے خدا اور رسول (اسلامی نظام) کی اطاعت کی تو تمہارے اعمال میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی"۔ لفظ أَسْلَمْنَا کے اعتبار سے ان لوگوں کو (ہماری اصطلاح میں) مسلمان کہا جائے گا۔ یعنی مومن تو وہ ہیں کہ ایمان جن کے قلب کی گہرائیوں میں اتر چکا ہو۔ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ (۵۸/۲۲) "ایمان ان کے دلوں میں منقوش ہو چکا ہو"۔ اور مسلمان وہ ہیں جن کے ایمان کی یہ کیفیت تو نہیں لیکن انہوں نے اسلام کو بہ حیثیت نظام زندگی اختیار کر لیا ہے۔ یاد رہے کہ ان لوگوں سے بھی اسلامی نظام بزور شمشیر نہیں منوایا گیا تھا۔ اسے انہوں نے بطیب خاطر اختیار کیا تھا۔ نہ ہی قرآن نے ان لوگوں کو منافق کہا ہے۔ منافق وہ ہوتا ہے جو دل سے ان صداقتوں کا مخالف ہو لیکن کسی مصلحت کے ماتحت زبان سے اس مخالفت کا اقرار نہ کرے اور فریب دہی کے طور پر مسلمانوں کے زمرہ میں شامل ہو جائے۔

جہاں تک ہم (موجودہ) مسلمانوں کا تعلق ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا شمار کس شق (CATEGORY) میں کیا جائے مومن تو ہم ہیں نہیں کیونکہ بہ حیثیت مجموعی ہم نے اسلام کو علیٰ وجہ البصیرت اختیار نہیں کیا۔ نہ ہی ہم زمانہ نزول قرآن کے اعراب (بدوؤں) کی طرح کے مسلمان ہیں کہ ہم نے اسلامی نظام کی کشش و جاذبیت کی بنا پر اپنے آپ کو اس کی سپردگی میں نہیں دیا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، ایمان لانے یا مسلمان ہونے کے لئے کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن ہم کچھ کئے بغیر ہی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ ہمارا مسلمان ہونا اس سے زیادہ کیا ہے کہ ہم ان لوگوں کے گھر میں پیدا ہو گئے جو خود ہمارے ہی جیسے مسلمان تھے اور یہ بھی واضح ہے کہ ہمارا شمار ان میں بھی نہیں ہوتا جنہیں قرآن نے منافقین کہہ کر پکارا تھا۔ یعنی وہ جو دل سے تو کافر ہوں لیکن کسی مصلحت کے تابع زبان سے اپنے آپ کو مسلمان کہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر دیکھئے تو (قرآنی نقطہ نظر سے) ہمارا وجود ایک چیستان سے کم نہیں۔

لیکن اس کے باوجود، بعض حقائق ایسے ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً

(۱) ہم نے بیشک اسلام کو علیٰ وجہ البصیرت اختیار نہیں کیا لیکن غیر شعوری طور پر ہماری اس سے قلبی وابستگی ایسی شدید ہے کہ (جہالت کی اور بات ہے) کفر کی کسی بات کو زبان پر لانے سے ہمارا دل دہل جاتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ، ہم کچھ بھی ہیں، کوئی غیر مسلم قوم ہمیں اپنے میں سے نہیں سمجھتی۔ وہ ہمیں اپنے سے الگ ضرور قرار دیتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ، اس کے باوجود کہ ہم میں کوئی بات ایسی نہیں جس کی بنا پر قرآن کی بارگاہ سے ہمیں مومن یا مسلم

ہونے کی سند عطا ہو جائے، ایک بات ایسی ہے جو ہم میں ابھی تک بطور قدرِ مشترک موجود ہے اور جس کی بنا پر ہم ایک منفرد تشخص کے حامل اور غیر مسلموں سے الگ قرار پاتے ہیں۔ اور وہ ہے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف ہماری نسبت اور آپؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کے ساتھ ہماری والہانہ شیفتگی اور جاں سپارانہ جذبۂ محبت و احترام ـــــ یہ وہ نام نامی اور اسم گرامی ہے جس کے متعلق ہر مسلمان کے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز ابھرتی ہے کہ

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو — چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو — بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

اور یہیں سے میری بات آگے چلتی ہے۔

۷۔ اُمّت

یہ بتایا جا چکا ہے کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ مذہب انفرادی ہوتا ہے، لیکن دین اجتماعی نظام کا نام ہے۔ اجتماعیت کا تقاضا ایک جماعت کا وجود ہے۔ یعنی اجتماعی نظام کے لئے ایک جماعت کا وجود ناگزیر ہے۔ عصرِ حاضر میں اس کے لئے قوم یا نیشن کا لفظ رائج ہے۔ قرآن کریم نے اس کے لئے اُمّت کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس نے جماعتِ مومنین کے متعلق کہا ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۱۰) تم بہترین قوم (اُمّت) ہو جسے نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے متشکل کیا گیا ہے۔ مذہب اور دین میں یہ بھی بنیادی فرق ہے۔ مذہب پر خلوت گاہوں میں، خانقاہوں میں، غاروں میں، جنگلوں میں، انفرادی طور پر عمل پیرا رہا جا سکتا ہے۔ دین پر اس طرح عمل پیرا نہیں رہا جا سکتا ہے۔ اس میں وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (۲/۴۳) "جھکنے والوں کے ساتھ مل کر جھکنا" لازمی ہے۔ دین کی رو سے عطا ہونے والی جنت کے متعلق بھی ارشاد ہے کہ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي (۸۹/۲۹-۳۰) "میرے بندوں میں شامل ہو جا اور جنت میں داخل ہو جا"۔ دورِ حاضر کے سیاسی لغت میں قوم (نیشن) ان افراد کے مجموعہ کا نام ہے جو کسی خاص خطۂ زمین یا خاص مملکت کی حدود کے اندر بستے ہوں خواہ ان کے نظریات، زندگی اور تصوراتِ حیات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کے برعکس اسلام میں اُمّت ان افراد کے مجموعہ کا نام ہے جو قرآن کریم کی صداقتوں پر ایمان لانے کے بعد اس حقیقت میں شامل ہوئے ہوں، خواہ وہ دنیا کے کسی ملک میں رہتے ہوں، کوئی زبان بولتے ہوں اور کسی نسل یا قبیلہ یا خاندان سے متعلق ہوں۔ یہ جماعت یا اُمّت ایک مملکت قائم کرتی ہے تاکہ اس میں اسلام ایک زندہ نظام کی شکل میں کارفرما ہو۔ اس مملکت کی حدود میں مسلم بھی ہوں گے اور غیر مسلم بھی۔ ان دونوں کی حیثیتوں اور حقوق و فرائض میں فرق ہوگا۔ بنا بریں، اس مملکت میں بسنے والے تمام افراد کے متعلق واضح طور پر متعین اور معلوم ہونا چاہیئے کہ فلاں مسلم ہے اور فلاں غیر مسلم۔ اس وقت اسلام نے چونکہ ایک مذہب کی شکل اختیار کر رکھی ہے اس لئے اس میں کفر اور اسلام (یعنی کسی کے مسلم یا غیر مسلم ہونے کے فیصلے) مذہبی پیشوائیت کے فتووں کی رُو سے ہوتے ہیں۔ ان فتووں سے فتویٰ دینے والوں کی انانیت یا پندارِ نفس کی تسکین تو ہو جاتی ہے لیکن ان کا عملی مفہوم کچھ نہیں ہوتا۔ جس مسلمان پر یہ کفر کا فتویٰ لگا

دیتے ہیں وہ بدستور مسلمان رہتا ہے۔ اس کی، فتوے سے پہلے اور بعد کی حیثیتوں میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن دین میں مسلم اور غیر مسلم میں فرق کرنا مملکت کے لئے آئینی طور پر ضروری ہوتا ہے کیونکہ جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے ان دونوں کی حیثیتوں میں آئینی طور پر فرق ہوتا ہے۔ دین میں جب مملکت کسی فرد کے متعلق فیصلہ دے دیتی ہے کہ وہ مسلم نہیں تو وہ، اس فیصلے کے ساتھ اس گروہ کا فرد قرار پا جاتا ہے جسے غیر مسلم کہا جاتا ہے اور جس کے حقوق و فرائض مسلم جماعت سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ اس مملکت کے آئین میں مسلم اور غیر مسلم میں فرق کرنے کا واضح اور متعین معیار موجود ہو۔ بالفاظ دیگر، ایک ایسا معیار موجود ہو جس کی رو سے فیصلہ کیا جا سکے کہ ایک شخص اس امّت کا فرد ہے یا نہیں۔

اس سے یہ اہم سوال ہمارے سامنے آ جاتا ہے کہ دین میں اُمّت کی تشکیل کا معیار کیا ہے۔ یعنی کون شخص اس اُمّت کا فرد بن سکتا ہے؟ اسے سمجھنے کے لئے دو ایک مثالیں سامنے لائیے۔ ایک یہودی، اس تعلیم کی صداقت پر ایمان رکھنے کا مدعی ہوتا ہے جو انبیائے بنی اسرائیل کو خدا کی طرف سے ملی تھی لیکن وہ اس سلسلۂ انبیاءؑ کو حضرت عیسیٰؑ سے پہلے ختم کر دیتا ہے۔ وہ حضرت عیسیٰؑ کو ان میں شامل نہیں کرتا۔ اس اعتبار سے وہ عیسائیوں سے الگ، یہودی قوم کا فرد رہتا ہے۔ لیکن جونہی وہ حضرت عیسیٰؑ کو بھی اس سلسلہ میں شامل کر لیتا ہے وہ اُمّتِ یہودیہ سے کٹ کر، اُمّتِ عیسوی میں شامل ہو جاتا ہے۔

ایک عیسائی حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک تمام انبیاء کو مانتا ہے لیکن اس سلسلہ کو حضرت عیسیٰؑ پر ختم کر دیتا ہے۔ اُسے اُن سے آگے نہیں بڑھاتا۔ جب تک وہ اس مسلک پر قائم رہتا ہے، اُمّتِ عیسوی کا فرد کہلاتا ہے۔ لیکن جونہی وہ اس سلسلہ کو آگے بڑھا کر، حضور نبی اکرمؐ کی رسالت پر ایمان لاتا ہے —— یعنی سلسلۂ انبیاءؑ کو حضرت عیسیٰؑ پر ختم سمجھنے کے بجائے، اُن کے بعد ایک اور نبی کی نبوت پر ایمان لے آتا ہے —— وہ اُمّتِ عیسوی سے کٹ کر، اُمّتِ محمدیہ کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ یاد رکھئے۔ یہ عیسائی، نبی اکرمؐ کی نبوت پر ایمان لانے سے، حضرت عیسیٰؑ یا آپ سے پہلے کے انبیاء کی نبوت سے انکار نہیں کرتا۔ انہیں بدستور نبی مانتا ہے۔ لیکن پہلے یہ حضرت عیسیٰؑ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی مانتا تھا، اب یہ انہیں آخری کڑی نہیں مانتا، اس سلسلہ کو اُن کے بعد بھی جاری سمجھتا ہے اور اسی بنا پر حضور نبی اکرمؐ کی نبوت پر ایمان لاتا ہے۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ ایک شخص اُس نبی کی اُمّت کا فرد کہلاتا ہے جسے وہ سلسلۂ انبیاءؑ کی آخری کڑی سمجھتا ہے۔ جونہی وہ اس سلسلہ کو آگے بڑھاتا ہے اس کا سلسلہ سابقہ نبی کی اُمّت سے منقطع ہو جاتا ہے اور وہ اس کے بعد کے نبی کی اُمّت کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر، انسان، وحی کے حقائق پر ایمان لانے سے تو، یوں کہئے کہ خدا پر ایمان لاتا ہے۔ لیکن اُمّت میں وہ اس نبی کی شامل ہوتا ہے جسے وہ سلسلۂ انبیاءؑ کی آخری کڑی مانتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو کس قدر بلیغ انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ :-

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید　　وز رسالت در تنِ ما جاں دمید

ما ز حکمِ نسبتِ او ملّتیم　　اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم

فرد از حق، ملّت از وے زندہ است　　از شعاعِ مہرِ او تابندہ است

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد   بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

رونق از ما محفلِ ایام را

او رُسل را ختم و ما اقوام را

اور یہی وہ حقیقت جس کی وضاحت کے لئے قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین، امتِ محمدیہ سے کہا کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲/۱۴۳)۔ اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی اُمت بنایا تاکہ تم تمام نوعِ انسان کے اعمال کے نگران ہو، اور رسول تمہارے اعمال کا نگران ہو۔ لہٰذا، اُمتِ محمدیہ کا فرد ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ شخص

(۱) قرآنِ کریم کو، خدا کی طرف سے عطا کردہ، واحد، مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ضابطۂ حیات مانے۔

(۲) اور حضور نبی اکرمؐ کو سلسلۂ انبیاء کرامؑ کی آخری کڑی تسلیم کرے۔

اسی کو مسلمان کہیں گے[1]۔

۸۔ دو قومی نظریہ

یہ امت (پوری کی پوری اُمت) عصرِ حاضر کی اصطلاح میں، ایک قوم کہلائے گی، خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بستی ہو ——— اور دنیا کے تمام دیگر باشندے، دوسری قوم کے افراد ——— اس طرح ساری دنیا کے انسان دو قوموں میں بٹ جائیں گے ——— مسلم اور غیر مسلم ——— قرآنِ کریم کے الفاظ ہیں:-

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴/۲)

خدا نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تم میں سے کچھ مومن ہو گئے کچھ کافر۔

یعنی پیدائش کے اعتبار سے، صرف انسان پیدا ہوتے ہیں۔ پھر وہ نظریۂ زندگی کے معیار کے مطابق، دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں ——— ایک گروہ مومنین کا دوسرا غیر مسلموں کا، اسی کو "دو قومی نظریہ" کہا جاتا ہے۔ یاد رکھئے۔ "دو قومی نظریہ" نہ تو ہندوستانی باشندوں کی نسبت سے وجود میں آیا تھا اور نہ ہی یہ تحریک یا مطالبۂ پاکستان کا پیدا کردہ تصور تھا۔ یہ اسلام کی ایک ابدی صداقت ہے جو اُس دن ظہور میں آئی تھی جب خدا نے پہلے پہل انسانوں کو وحی عطا کی۔ اور یہ ابد تک قائم رہے گی۔ دو قومی نظریہ (TWO NATION THEORY) کی اساس خود اسلام ہے۔ اس کا تعلق نہ پاکستان سے ہے نہ نام نہاد "بنگلہ دیش" سے۔ جب تک دنیا میں ایک شخص بھی مسلم رہے گا، دو قومی نظریہ زندہ رہے گا۔

چونکہ اس سوال نے آج کل خاص اہمیت اختیار کر رکھی ہے اس لئے اس کی مزید وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ میں نے بتایا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے

---

[1] ۱۹۷۴ء میں حکومتِ پاکستان نے "احمدیوں" کو غیر مسلم قرار دیا اور اس طرح وہ آئینی طور پر امتِ مسلمہ سے الگ ہو گئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، ایسا کرنے کا حق صرف مملکت کو حاصل ہوتا ہے۔ افراد کو نہیں۔

(۱) دنیا کے تمام مسلمان، ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم کے افراد ہوں گے۔ اس قوم (یا امت) کے اندر نسل، زبان، جغرافیائی یا سیاسی حدود کے امتیاز سے مختلف قوموں کی تشکیل، اسلام کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ اور

(۲) کوئی غیر مسلم، اس (مسلم) قوم کا فرد قرار نہیں پا سکتا خواہ وہ انہی کی مملکت کے اندر کیوں نہ رہتا ہو۔ اسلام کی یہ بنیادی حقیقت مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ ہم نے کوشش کی کہ ہندوستان میں ایک الگ خطۂ زمین حاصل کر سکیں، اس میں اس تصور کا احیاء کریں، اور جب یہ تصور یہاں عملاً قائم ہو جائے تو پھر اس سلسلہ کو دوسرے ملک کے مسلمانوں تک بھی بڑھایا جائے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر ہم نے ہندوستان میں دو قومی نظریہ کی اشاعت کی اور اس میں ہم بفضلِ ایزدی کامیاب ہو گئے۔ لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد ہم نے خود پہلے اس کے ایک حصہ کی تردید کر دی۔ یعنی پاکستان کی حدود میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم قرار دے دیا۔ بالفاظِ دیگر، ابھی ابھی ہم ہندوستان میں کہہ رہے تھے کہ مملکتِ ہند میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد قرار نہیں پا سکتے لیکن جونہی ہم نے واگہ کی سرحد پار کی، ہم نے اقرار و اعلان کر دیا کہ پاکستان کی حدود میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد ہیں۔ غیر مسلموں کو ہم نے اقلیتیں قرار دے دیا لیکن اب تو ہندوستان میں بھی ہے دہلی مسلم اور غیر مسلم انڈین نیشنل ہیں اور کم آبادی والے غیر مسلم اقلیتیں۔ یہی صورت یہاں ہے۔ یہاں ہم نے دو قومی نظریہ کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔

اب ہم اس نظریہ کے دوسرے حصہ کا مذاق اڑا رہے ہیں جب کہ رہے ہیں کہ مغربی پاکستان کے مسلمان ایک قوم نہیں بلکہ چار قوموں میں منقسم ہیں یعنی یہاں کے مسلمان اور غیر مسلم تو ایک قوم کے افراد ہیں لیکن خود مسلمان ایک قوم کے افراد نہیں، ان کی چار الگ الگ قومیتیں ہیں۔ یا للعجب۔ میں، برادرانِ عزیز! اس قرآنی بصیرت کی شہادتِ عظمیٰ کے زور پر جو مجھے بتوفیقِ ایزدی حاصل ہوئی ہے، دل کی پوری قوت سے اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں تصورات اسلام کے یکسر خلاف ہیں۔ یعنی یہ تصور کہ پاکستان (یا دنیا کے کسی اور حصہ کے) مسلمان اور غیر مسلم، وطن کے اشتراک کی بنا پر، ایک قوم کے افراد ہیں، اور خود مسلمانوں کے اندر مختلف قوموں کا وجود ممکن ہے۔ آپ اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر جو جی میں آئے کہئے اور کیجئے۔ لیکن یہ دونوں نظریات اسلام کے بنیادی تصورات کے خلاف ہیں۔ اور اگر آپ اس مملکت کو اسلامی بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو ان دونوں نظریات کو مردود قرار دینا پڑے گا۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام نے شعوب اور قبائل کا امتیاز روا رکھا ہے اور انہی کو ہم مختلف قومیتیں کہتے ہیں۔ شعوب و قبائل سے ان کا اشارہ سورۂ حجرات کی اس آیت کی طرف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ (۴۹/۱۳)۔

لیکن اس آیت کو بطورِ دلیل پیش کرنے والے اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ یہ آیت خود ان کے دعوے کی تردید کرتی ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ تمام انسانوں کو نر و مادہ کے اختلاط سے پیدا کیا گیا ہے، اس لئے انسان ہونے کی جہت سے ان میں کسی قسم کا فرق اور امتیاز نہیں۔ اگر امتیاز ہے تو صرف ایمان کے اشتراک اور سیرت و کردار کی بلندی کی رُو سے ہے۔ باقی رہے تمہارے قبیلے اور خاندان، سو ان کا مقصد، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تم ایک دوسرے سے متعارف ہو سکو۔ زمانۂ نزولِ قرآن کے عرب بالعموم صحراؤں میں خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ (وہاں اب بھی

آبادی کی اکثریت کا یہی نہج بود و ماند ہے) اُس قسم کی صحرا نشینی کی زندگی میں بجز قبائلی نسبت کے ایک دوسرے کو پہچاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ قرآن کریم نے کہا کہ اسلام لانے کے بعد تم سب ایک امت کے افراد بن جاؤ گے، لیکن جب تک تم میں کوئی اور علامتِ تعارف پیدا نہ ہو، قبیلوں اور خاندانوں کی موجودہ علامتیں یہ مقصد پورا کرتی رہیں گی۔ باہمی تعارف کی جب اور علامات وجود میں آجائیں گی تو قبیلوں اور خاندانوں کی علامتیں خود بخود مٹ جائیں گی۔ چنانچہ آج ہم جب اپنے ہاں کی تمدنی (شہری) زندگی کو دیکھتے ہیں تو اس میں ذاتوں اور گوتوں کی علامات وجہِ تعارف نہیں رہیں۔ باہمی تعارف کا ذریعہ اور قسم کی علامات بن چکی ہیں۔ اس وجہ سے اب یہاں ذاتوں اور گوتوں کا تعارف نہیں رہا۔ بس یہ تھا مقصد عربوں کے ہاں شعوب و قبائل کی تعارفی علامات کے باقی رکھنے کا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جہاں کہیں یہ محسوس ہوا کہ قبائلی امتیاز، وجہِ تعارف سے آگے بڑھ کر، کسی اور امتیاز کا موجب بن رہا ہے، اسے شدت سے روک دیا گیا۔ ایک جنگ میں، دو مسلم سپاہیوں میں کسی بات پر باہمی جھگڑا ہو گیا تو ان میں سے ایک نے (زمانۂ جاہلیت کے طریق کے مطابق، غالباً غیر شعوری طور پر) اپنے قبیلہ کو مدد کے لئے پکارا اور دوسرے نے اپنے قبیلہ کو۔ جب حضورؐ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ سخت برافروختہ ہوئے اور ان سے کہا کہ کیا تم لوگ اسلام لانے کے بعد، پھر عصبیتِ جاہلیہ کی طرف لوٹ گئے ہو؟ اور یہی وہ جاہلیت کی عصبیتیں تھیں، جن کے متعلق حضورؐ نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں اعلان فرمایا تھا کہ میں نے ان سب کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا ہے۔ حیرت ہے کہ وہ عصبیتیں جنہیں حضورؐ نے اس طرح اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا، اب انہیں قومیتوں کا نام دے کر از سرِ نو زندہ کیا جا رہا ہے اور بجائے اس کے کہ اس پر ندامت محسوس ہو کہ ہم اس قسم کی غیر اسلامی حرکتیں کیوں کر رہے ہیں، سینہ تان کر کہا جاتا ہے کہ اسلام نے ان کی اجازت دی ہے۔ جن لوگوں نے اسلام کو سمجھا تھا ان کی تو کیفیت یہ تھی کہ جب حضرت سلمانؓ پارسی سے پوچھا گیا کہ نام، تو آپ نے کہا سلمان۔ اور جب پوچھا گیا کہ باپ کا نام، تو آپ نے فرمایا — اسلام — وہ لوگ ولدیت کے امتیاز سے بھی امت میں تفریق پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے اور ہم آج، اپنے مسلمان ہونے کے زمانے سے پہلے کے نسلی امتیازات اور انگریزوں کی کھینچی ہوئی صوبوں کی لکیروں کی تفریقات سے الگ الگ قومیتیں متشکل کر رہے ہیں اور انہیں اسلامی قرار دے رہے ہیں۔ کس قدر مظلوم ہے آج دنیا میں اسلام کہ جس کا جی جو چاہے اس کی طرف منسوب کر کے اسے بدنام کرتا پھرے۔ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ یاد رکھئے! جب تک ہم بلوچ، سندھی، پنجابی پٹھان کے امتیازات کو مٹا نہیں دیں گے اسلام کے حصار میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔

۹۔ نظریہ پاکستان

ہم نے دیکھا ہے کہ اسلام بہ حیثیت دین (نظامِ زندگی) اسی صورت میں کارفرما ہو سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ اگر اپنی آزاد مملکت نہ ہو، تو یہ صرف مذہب کی شکل میں باقی رہ سکتا ہے۔ ہندوستان میں، اسلام مذہب کی حیثیت میں باقی رہ سکتا تھا۔ دین کی شکل اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ اسے دین کی صورت میں متشکل کرنے کے لئے ہم نے ایک آزاد مملکت کے حصول کا مطالبہ کیا۔ اسی کو نظریۂ پاکستان کہتے ہیں۔ یعنی ایک ایسی مملکت کا حصول جس میں اسلام، ایک عملی نظامِ حیات کی شکل میں کارفرما ہو۔ بنا بریں، نظریۂ پاکستان بھی کوئی ہنگامی تصور نہیں تھا۔

یہ اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔ داعیانِ نظریۂ پاکستان سے مراد وہ لوگ تھے جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے تھے کہ اسلام صرف اپنی آزاد مملکت میں دین کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ اپنی آزاد مملکت نہ ہو تو اس کے دین بننے کا امکان نہیں ہوتا۔ اس صورت میں اسلام مذہب بن جاتا ہے اور سٹیٹ سیکولر جو یکسر غیر اسلامی تصور ہے۔

۱۰۔ اسلامک سٹیٹ

قرآنِ کریم نے اسلامی اور غیر اسلامی مملکت میں اس طرح واضح اور بین طور پر فرق کر کے بتا دیا ہے کہ اس کے سمجھنے میں نہ کسی قسم کا ابہام ہو سکتا ہے، نہ التباس۔ اس نے کہا ہے کہ

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ٥ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی نازل کردہ کتاب (قرآنِ کریم) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی کافر ہوتے ہیں۔

قائداعظمؒ نے اسی حقیقت کو چار لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا جب کہا کہ

اسلامی مملکت کی آزادی اور پابندی کی حدود، خدا کی کتاب متعین کرتی ہے۔

عصرِ حاضر کے سیاسی تصور کی رو سے آزاد اور خود مختار ریاست (SOVEREIGN STATE) وہ ہوتی ہے جو اپنے ہر فیصلہ میں کاملتہً آزاد ہو، اور کوئی اتھارٹی ایسی نہ ہو جو اس پر کسی قسم کی پابندی عائد کر سکے۔ قرآن کی رو سے خدا کی کتاب وہ حدود متعین کرتی ہے جن کے اندر رہتے ہوئے اسلامی مملکت آزاد اور خود مختار ہوتی ہے۔ کتاب اللہ کی اسی اتھارٹی کو خدا کی حاکمیت یا اقتدارِ اعلیٰ کہتے ہیں۔ عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ خدا کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے کے بعد، مملکت کی (SOVEREIGNTY) باقی نہیں رہتی۔ یہ اعتراض غلط نگہی پر مبنی ہے۔ دنیا کی ہر سٹیٹ، دوسری سٹیٹس کے ساتھ معاملات میں ساورن ہوتی ہے لیکن اپنے آئین کی پابندی اس پر بھی لازم ہوتی ہے۔ اپنے آئین کی پابندی سے اس مملکت کی ساورنٹی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یہی کیفیت اسلامک سٹیٹ کی ہوتی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ دنیا کی عام سٹیٹس اپنے لئے آپ آئین مرتب کرنے، یا اس میں ردو بدل کرنے کی مجاز ہوتی ہیں، لیکن اسلامک سٹیٹ اپنے آئین کے اصول و حدود خود مرتب نہیں کر سکتی یہ خدا کی طرف سے متعین کردہ ہیں، جن سے نہ اسلامک سٹیٹ انحراف کر سکتی ہے نہ ان میں تغیر و تبدل۔ ان غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے یہ سٹیٹ اپنے داخلی معاملات میں بھی ساورن ہوتی ہے اور خارجی معاملات میں بھی ساورن۔ یاد رکھئے، سیکولر سٹیٹ سے مراد ہوتی ہے وہ مملکت جس کے حدود و اختیارات پر کسی کا کنٹرول نہ ہو۔ یہ اصطلاح اسلامک سٹیٹ کی ضد ہے۔ اس اصطلاح کو اپنے ہاں اختیار کر کے یہ کہنا کہ یہ اسلام کے منافی نہیں یا خود فریبی ہے یا فریب دہی۔

۱۱۔ جمہوریت

یہیں سے مغربی جمہوریت اور اسلامی شورائیت کا فرق سامنے آجاتا ہے۔ مغربی نظامِ جمہوریت میں عوام کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہوتا ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ عوام کے نمائندے جس قسم کا آئین جی چاہے مرتب کریں،

اور جس قسم کے قوانین جی چاہے وضع کریں۔ ان کے اس اختیار پر کوئی پابندی نہیں عائد کی جا سکتی۔ اس کے برعکس اسلامک سٹیٹ میں اُمت کے نمائندے، مملکت کا آئین اور حکومت کے لئے قوانین، باہمی مشاورت سے اُن حدود کے اندر رہتے ہوئے وضع کر سکتے ہیں جو کتاب اللہ نے متعین کی ہیں۔ کتاب اللہ کی یہ حدود غیر متبدل رہتی ہیں اور ان کے اندر رہتے ہوئے مرتب کردہ قوانین وضوابط، حالات کے تقاضے اور زمانے کی ضرورتوں کے مطابق بدلے جا سکتے ہیں۔ ان قوانین وضوابط کو شریعت کہا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر اسلامی مملکت میں دین تو غیر متبدل رہے گا لیکن شریعت بدلتی رہے گی۔ یہ شریعت، مرتب کردہ ہوگی اُمت کے نمائندوں کی۔ اس لئے اسلامک سٹیٹ میں مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں ہوگا۔ لہٰذا، یہ سٹیٹ تھیاکریٹک بھی نہیں ہوگی۔

قانون سازی کے سلسلہ میں قرآن کریم نے ایک عظیم حقیقت بیان کی ہے۔ ہر حکومت کا بنیادی فریضہ عدل قرار دیا جاتا ہے، اور عدل سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ جو فیصلہ ملک کے مروجہ قانون کے مطابق ہو وہ عدل (JUSTICE) ہے۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ جو فیصلہ قانون کے مطابق ہو اسے عدل کہا جائے گا لیکن اگر وہ قانون ہی ایسا ہے جو ظلم پر مبنی ہے تو اس کے مطابق فیصلہ کو عدل کیسے کہا جا سکے گا؟ لہٰذا، دیکھنے کی بات یہ ہوگی کہ وہ قانون کس قسم کا ہے۔ مغربی اندازِ حکومت کی رو سے دیکھا صرف یہ جاتا ہے کہ جو قانون ملک میں نافذ کیا جا رہا ہے وہ مملکت کے آئین اور قانون سازی کے ضوابط پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ قانون ان شرائط کو پورا کرتا ہے تو وہ جائز (VALID) قرار پائے گا اور اس کے مطابق، متنازعہ فیہ معاملات کے فیصلے مبنی بر عدل تسلیم کئے جائیں گے۔ لیکن قرآن کی رو سے کسی قانون کے جائز یا ناجائز قرار پانے کا صرف یہی معیار نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ان تمام شرائط کے ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہوگا کہ وہ قانون، ان مستقل اقدار و اصول کے بھی مطابق ہے یا نہیں جو کتاب اللہ میں مذکور ہیں۔ اگر وہ ان کے مطابق ہے تو وہ جائز قانون ہے۔ اگر ان سے ٹکراتا ہے تو ناجائز ہے خواہ وہ آئینِ مملکت کی تمام شرائط کو بھی پورا کیوں نہ کر رہا ہو! اُس کا اعلان یہ ہے کہ اسلامی مملکت وہ ہے جس کا انداز یہ ہو کہ یَقْضُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ (۷/۱۸۱)۔ وہ اَلْحَقّ کے مطابق لوگوں کو چلاتی ہے اور اسی کے مطابق عدل کرتی ہے۔ اَلْحَقّ (THE TRUTH) قرآن کی رُو سے وحیِ خداوندی کو کہا جاتا ہے۔ جو مملکت ایسا کرتی ہے وہ اسلامی مملکت کہلاتی ہے۔ جو ایسا نہیں کرتی وہ سیکولر (غیر اسلامی) ہوتی ہے۔

۱۲۔ مملکت کا مذہب

کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں ایک اور نعرہ بھی بلند کیا جا رہا ہے اور وہ یہ کہ آئین میں یہ شق رکھی جانی چاہئے کہ مملکتِ پاکستان کا مذہب اسلام ہوگا۔

پچھلے دنوں مستقل آئین کے اصولوں کے سلسلہ میں، مختلف سیاسی پارٹیوں کا جو اتفاق رائے ہوا ہے، اس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ مملکت کا مذہب (STATE RELIGION) اسلام ہوگا۔ انہوں نے فیصلہ تو ایسا کر لیا ہے لیکن اگر آپ ان سے پوچھیں کہ اس کا مطلب کیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں بتا سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب ایک جیتے جاگتے انسان کا ہوتا ہے۔ ہم ایک فرد سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس کا مذہب

کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر کچھ ہم مذہب افراد ایک جماعت کی شکل اختیار کر لیں، تو یہ کہا جائے گا کہ اس جماعت کا یہ مذہب ہے۔ اس کے معنی بھی یہی ہوں گے کہ وہ جماعت جن افراد پر مشتمل ہے ان کا مذہب یہ ہے۔ لیکن مملکت نہ کوئی فرد ہوتی ہے، نہ افراد کا مجموعہ۔ وہ ایک مجرد (ABSTRACT) سی شے ہے جس کی کوئی جامع تعریف بھی آج تک نہیں کی جا سکی۔ سمجھنے کے لئے یوں کہئے کہ مملکت کسی خطۂ زمین کے اندر ایک سیاسی نظام کا نام ہوتا ہے اور نظام کا کوئی مذہب نہیں ہو سکتا۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ فلاں نظام کا، مذہب اسلام ہے۔ لہٰذا، یہ فیصلہ کہ مملکتِ پاکستان کا مذہب اسلام ہوگا محض سطحی جذباتیت ہے جس کا عملی مفہوم کچھ نہیں۔ مطالبہ یہ ہونا چاہیئے کہ مملکتِ پاکستان کو اسلامی مملکت ہونا چاہیئے، اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اسلامی مملکت سے مراد ہوگی وہ مملکت

جس کی آزادی اور پابندی کے حدود خدا کی کتاب (قرآنِ کریم) متعین کرے۔

۱۳۔ سیکولر سٹیٹ کی مزید وضاحت

اسی سے یہ حقیقت بھی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ سیکولر سٹیٹ کسے کہا جاتا ہے۔ اجمالاً اتنا کہنا کافی ہوگا کہ جو سٹیٹ اسلامک نہیں، وہ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے سیکولر ہے۔ یعنی اسلامی نقطۂ نگاہ سے غیر اسلامی مملکت (UN-ISLAMIC STATE) اور سیکولر سٹیٹ مرادف الفاظ ہیں۔ تفصیل میں جانے سے یہ کہا جائے گا کہ جس سٹیٹ کے فیصلے وحی کی رُو سے عطا کردہ مستقل اقدار اور غیر متبدل اصول و احکام (یعنی قرآنِ کریم) کے تابع ہوں گے وہ اسلامک ہوگی جس پر اس قسم کی پابندی نہیں ہوگی وہ سیکولر ہوگی۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، قرآنِ کریم نے ایک چھوٹی سی آیت میں اسلامک سٹیٹ اور سیکولر سٹیٹ کا فرق نکھار اور اُبھار کر بیان کر دیا ہے جب کہا کہ

مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴)

جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ یعنی جو مملکت، ما انزل اللہ کے تابع رہتی ہے وہ اسلامی ہے۔ جو اس کے کنٹرول کو تسلیم نہیں کرتی وہ سیکولر ہے۔ سیکولرازم کی وضاحت لینن نے واضح الفاظ میں کر دی تھی جب کہا تھا کہ

> ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی ما فوق البشر سرچشمہ یا غیر طبقاتی تصور کے پیدا کردہ ہیں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصور فریب ہے۔ دھوکا ہے۔ سرمایہ داری کا دھوتے ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق احکامِ خداوندی پر مبنی ہے۔ (ہم اس دعوے کو ٹھکراتے ہیں) ہم خدا وغیرہ کچھ نہیں جانتے۔ ہم اسے مانتے ہی نہیں۔ اخلاقِ انسانی معاشرہ ہی کا نام ہے۔ اس سے ماورا جو کچھ ہے فریب ہے۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر دیں گے۔

آپ یہ نہ سمجھئے کہ سیکولرازم، کمیونسٹوں تک محدود ہے۔ نہیں، سیکولرازم کا ہر جگہ انداز یہی ہے۔ آج دنیا میں ہر جگہ

سیکولر سٹیٹس قائم ہیں۔ ان سٹیٹس کا انداز یہ ہے کہ وہ امورِ مملکت میں مذہب کو دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مذہب انسان کا پرائیویٹ معاملہ ہے اس لئے اسے اس کی نجی زندگی تک ہی محدود رہنا چاہیئے۔ ہر فرد کو اجازت ہے کہ وہ جس قسم کا مذہب، جی چاہے اختیار کرے اسی طرح جیسے ہر فرد کو اجازت ہے کہ وہ جس قسم کے کپڑے جی چاہے پہنے یا جس قسم کا راگ جی چاہے سنے۔ لیکن مذہب یا اخلاق، مملکت پر کسی قسم کا کنٹرول نہیں کر سکتے اسی کو مذہب اور سیاست کی ثنویت (DUALISM) کہتے ہیں اس سے پرائیویٹ اور پبلک ضوابطِ اخلاق کی تفریق پیدا ہوتی ہے جس کے متعلق جوڈ لکھتا ہے کہ مغربی نظامِ سیاست میں :-

> پرائیویٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور ہے اور امورِ مملکت کے لئے ضابطہ کچھ اور۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں دیانتدار، رحمدل، اور قابلِ اعتماد ہوتے ہیں ان کا بھی عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ جب انہیں اپنی مملکت کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری مملکت کے نمائندوں سے معاہدہ کرنا ہو تو وہاں وہ سب کچھ کہ گزرنا کارِ ثواب ہے جسے وہ اپنی نجی زندگی میں نہایت شرمناک تصور کرتے تھے۔
>
> (GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS)

اور اسی حقیقت کو اٹلی کے مدبر (CAVOUR) نے سمٹا کر ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ :-

> اگر ہم اپنی ذات کے لئے وہی کچھ کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں

یہی وہ ثنویت ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

لبرل سیکولرازم زیادہ سے زیادہ اتنا کرتی ہے کہ ہر مذہب کے پیروؤں کو اجازت دیتی ہے کہ وہ مذہبی عقائد جس قسم کے جی چاہے رکھ لیں اور اپنے شخصی قوانین (پرسنل لاز) جیسے جی چاہے مرتب اور اختیار کر لیں۔ اس سے آگے وہ مذہب کو کسی دائرے میں دخیل کار نہیں ہونے دیتی۔ تقسیمِ ہند سے پہلے، ہندو اسی قسم کی سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے، اور نیشنلسٹ مسلمان، اور ان کے مذہبی راہ نما، اسے عین مطابقِ اسلام قرار دیتے تھے۔ اسی کے خلاف ہماری جنگ تھی، کیونکہ یہ تصور ایک کافرانہ سٹیٹ کا ہو سکتا ہے، اسلامی سٹیٹ کا نہیں۔ عقائد اور پرسنل لاز تک اسلام کو تسلیم کرنا اور باقی شعبۂ حیات کو انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے تابع رکھنا، اس قسم کا کفر ہے جسے قرآنِ کریم نے سنگین ترین جرم قرار دیا ہے۔ اس کا ارشاد ہے: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ کیا تم ایسا چاہتے ہو کہ اس کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاؤ اور دوسرے حصے سے کفر برتو ؛ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ (۲/۸۵) ۔ سو تم میں سے جو بھی ایسی روش اختیار کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ دنیاوی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہوگا اور قیامت کے دن بھی عذابِ عظیم میں گرفتار۔

۱۴۔ مذہبی فرقے

فرقے مذہب میں ہوتے ہیں، دین میں مختلف فرقوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مذہب میں فقہیں الگ الگ ہوتی ہیں لیکن دین میں کوئی الگ فقہ نہیں ہوتی۔ اس میں مملکت کا ضابطہ قوانین ہوتا ہے جس کا اطلاق ہر ایک پر یکساں ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص یا جماعت کوئی الگ قانون وضع یا اختیار کرتی ہے تو وہ متوازی حکومت قائم کرتی ہے جو بغاوت کے مترادف ہوتا ہے۔ دین میں ایک امت ہوتی ہے۔ اس حکومت کا ایک ضابطہ قوانین ہوتا ہے جس کی اطاعت ہر ایک پر لازم ہوتی ہے۔ اگر کسی معاملہ میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کے تصفیہ کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور اس کے فیصلے کے سامنے ہر ایک کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

چونکہ مذہبی فرقے ایک مملکت کے اندر رہتے ہوئے شخصی قوانین کی حد تک ہی سہی ۔ الگ الگ ضوابط قوانین کے پابند ہوتے ہیں، اس لئے قرآن کریم اسے شرک قرار دیتا ہے (۳۰/۳۱) اور مرکز حکومت خداوندی۔ یعنی رسول اللہؐ سے کہتا ہے کہ ایسا کرنے والوں سے تیرا کوئی واسطہ نہیں (۶/۱۵۹)۔ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق کا تصور یکسر خلاف اسلام ہے۔ دین ایک ایسا نظام حیات ہے جس میں عقائد عبادات، باہمی معاملات، امور مملکت، پرسنل اور پبلک لاز، وغیرہ سب باہم گریبوست، بلکہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہیں۔ ان میں تفریق شرک ہے۔

۱۵۔ حریت فکر

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلامی حکومت میں افراد کو فکری آزادی حاصل ہوتی ہے، اور اگر حاصل ہوتی ہے تو کس حد تک۔ اس اہم سوال کو سمجھنے کے لئے اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ

(۱) جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، دین کے معاملہ میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہوتا۔ ہر شخص دین کو علیٰ وجہ البصیرت، پوری فکری آزادی کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔

(۲) جب ایک شخص اس طرح دین کو اختیار کر لیتا ہے تو اس پر دین کے قوانین و احکام کی اطاعت لازم آجاتی ہے۔ اسے اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ دین کا نظام اختیار کر لینے کے بعد جس قانون کو، اپنی فکر اور فہم کی رُو سے اچھا سمجھے اس کی اطاعت کرے، جسے اچھا نہ سمجھے اس کے خلاف چلا جائے۔ اس طرح دُنیا کا کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔

(۳) قرآن کریم میں کچھ آیات، قوانین یا ان کے اصولوں سے متعلق ہیں۔ انہیں وہ محکمات کہہ کر پکارتا ہے۔ ان کے علاوہ اس میں حقائق کائنات سے متعلق آیات ہیں جنہیں وہ متشابہات کہتا ہے یعنی وہ آیات جن میں حقائق کو تشبیہات اور استعارات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے، ان حقائق کو غور و فکر اور فہم و تدبر کی رُو سے سمجھا جا سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس باب میں، فکری اختلاف ہو سکتا ہے۔ ایک اختلاف مختلف

زمانوں کی فکر میں ہوگا۔ یعنی جوں جوں انسانی علم ترقی کرتا جائے گا، فکر کے دائرے وسیع ہوتے جائیں گے۔ اس لئے کسی ایک دور کی فکر بہ حیثیتِ مجموعی دوسرے دور کی فکر سے مختلف ہوگی۔ پھر ہر دور میں مختلف افراد کی فکری صلاحیتیں اور علمی وسعتیں مختلف ہوں گی اس لئے ان کی فکر کے نتائج بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ اس باب میں ہر ایک کو فکری آزادی حاصل ہوگی لیکن ایک شرط کے ساتھ۔ اور اس شرط کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ مثلاً حیات بعد الممات، اسلام کا بنیادی مسلّمہ ہے۔ جو شخص اسلام کا مدعی ہے اس کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے گا کہ اس نے پوری پوری فکری آزادی کے بعد، علم و بصیرت کی رُو سے اس مسلّمہ کی صداقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس کے بعد سے اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ جب جی چاہے اس مسلّمہ کی صداقت سے انکار کر دے۔ اگر کسی وقت وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ مسلّمہ (یا اس قسم کے دیگر قرآنی مسلّمات) مبنی بر صداقت نہیں تو وہ اسلام کو چھوڑ کر غیر مسلموں کے زمرہ میں شامل ہو سکتا ہے۔ اس کی اسے ہر وقت اجازت ہوگی۔ لیکن اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ اسلام کے دائرے میں رہتا ہوا، اس مسلّمہ کی صداقت سے انکار کرے۔

اب ایک قدم آگے بڑھئے۔ ایک مسلمان جو اس مسلّمہ کی صداقت کا قائل ہے، یہ سمجھتا ہے کہ مرنے کے بعد انسان پھر اسی جسم کے ساتھ، اسی شکل و صورت میں دوبارہ زندہ ہوں گے، لیکن دوسرا یہ سمجھتا ہے کہ وہ زندگی موجودہ مادی پیکروں کے ساتھ نہیں ہوگی۔ اس کی صورت اس سے مختلف ہوگی۔ تو ان دونوں کو، اپنی اپنی فکر کے مطابق ایسا سمجھ لینے کی اجازت ہوگی۔ اس قسم کے فکری اختلاف کی بنا پر نہ آپس میں سر پھٹول ہوگی، نہ ہی یہ چیز کسی فرقہ کی بنیاد بنے گی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، دین میں فرقہ بندی کی گنجائش یا اجازت ہی نہیں ہو سکتی۔

۱۶۔ سیاسی پارٹیاں

دین میں جب مذہبی فرقے نہیں ہوں گے تو الگ الگ سیاسی پارٹیاں کس طرح وجود پذیر ہو سکیں گی؟ مذہبی فرقہ اور سیاسی پارٹی کی تفریق مذہب میں ہوتی ہے جس میں سیاست اور مذہب الگ الگ ہوتے ہیں۔ دین میں سیاست اور مذہب میں کوئی تفریق نہیں ہوتی اس لئے اس میں نہ کوئی مذہبی فرقہ ہوتا ہے نہ سیاسی پارٹی۔ اس میں امتِ مسلمہ، غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک پارٹی ہوتی ہے، خود اس امت کے اندر پارٹیاں نہیں ہوتیں نہ ہی اس کے ایوان میں، امت دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہوتی ہے۔ ایک حزبِ اقتدار اور دوسری حزبِ اختلاف قرآن کریم نے تمام نوعِ انسان کو دو قوموں میں تقسیم کر دیا ہے —— ایک مومن اور دوسری کافر۔ انہی کو وہ دو حزب کہہ کر پکارتا ہے۔ ایک حزب اللہ اور دوسری حزب الشیطان ($\frac{۵۸}{۱۹-۲۲}$)۔ اسلامی مملکت کے ایوان —— (پارلیمان) میں تمام کے تمام ارکان وہ ہوں گے جو قرآنِ کریم کے عطا کردہ اصول و اقدار پر ایمان رکھتے ہیں اور جن کا فریضہ ان اصول و اقدار کو قانونی شکل دے کر ملک میں نافذ کرنا ہے۔ اس ایوان میں غور و فکر اس مسئلہ پر ہوگی کہ ان اصولوں کو بہ حالاتِ موجودہ نافذ کس طرح کیا جائے۔ یعنی یہ لوگ، پارلیمان میں بیٹھ کر مملکت کے لئے اصول و اقدار وضع نہیں کریں گے بلکہ صرف یہ سوچیں گے کہ ان اصول و اقدار کی تنفیذ کے

لئے طریقہ کون سا اختیار کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہر رکن اپنی اپنی رائے پیش کرے گا اور جو فیصلہ ہوگا اس کا اطلاق ہر ایک پر ہو جائے گا۔ اس میں حزبِ اقتدار کے بجائے بھی عمالِ حکومت (کارندے) ہوں گے۔ جن کا فریضہ یہ دیکھنا ہوگا کہ اس فیصلہ پر ٹھیک ٹھیک عمل ہو رہا ہے' انہیں بھی کوئی خصوصی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے۔ واضح رہے کہ اسلامی مملکت کی مجلسِ قانون سازی میں کوئی غیر مسلم شریک نہیں ہو سکے گا۔ بات بالکل واضح ہے۔ جو شخص کسی ضابطۂ قوانین کی اصل واساس کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا، وہ اس کے قوانین کی ترتیب میں شریک کیسے ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی کوئی غیر مسلم، مسلم قوم کا فرد قرار نہیں پا سکتا۔

۱۷۔ صوبجاتی خودمختاری

اس وقت ہمارے ہاں جس اصطلاح نے سب سے زیادہ شہرت اور اہمیت حاصل کر رکھی ہے وہ ہے صوبجاتی خودمختاری۔ یہی وہ شجرۃ الزقوم ہے جس کی وجہ سے آدھی مملکت ہم سے چھن چکی ہے اور باقی نصف کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ صوبوں (PROVINCES) کی حقیقت کیا ہے؟ انگریزوں نے انتظامی سہولت کے لئے ملک کو مختلف دائروں میں تقسیم کیا۔ سب سے نچلے درجہ پر تھانے قائم کئے۔ چند تھانوں کے دائروں پر مشتمل تحصیل قائم کی۔ چند تحصیلوں کو ملا کر ضلع بنایا۔ چند ضلعوں پر مشتمل کمشنری قائم کی۔ اور چند کمشنریوں کو ایک تنظیم کے رشتہ میں پرو کر اس کا نام صوبہ رکھ دیا۔ اس طرح ملک محض تنظیمی ڈھانچے کے طور پر مختلف صوبوں میں بٹ گیا۔ ان صوبوں کی بنیاد نہ کوئی ابدی صداقت تھی، نہ ان کا کوئی خارجی وجود۔ محض انتظامی سہولت کی خاطر نقشہ پر کھینچی ہوئی چند لکیریں تھیں۔ اور یہ لکیریں انتظامی مقاصد کے پیشِ نظر ادلتی بدلتی رہتی تھیں۔ ۱۹۰۲ء تک، موجودہ سرحد کا الگ تشخص نہیں تھا۔ وہ صوبہ پنجاب ہی کا حصہ تھا۔ ۱۹۳۵ء تک، سندھ صوبہ بمبئی کا ایک حصہ تھا۔ بلوچستان تو چند دن ہوئے جب الگ صوبہ بنایا گیا ہے۔ لیکن یہ طرفہ تماشا ہے کہ انگریز کی حکومت تک جن صوبوں کی یہ اصل وحقیقت تھی اب انہی صوبائی لکیروں کو قوم میں تفرقہ کی مستقل بنیادیں بنایا جا رہا ہے۔ انگریز کی عملداری میں ان صوبوں میں بسنے والوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ الگ الگ قومیں ہیں۔ لیکن اب یہاں چار صوبوں کی بنا پر چار الگ الگ قوموں کا تصور پیدا کیا جا رہا ہے' اور اعتراض سے بچنے کی خاطر، انہیں قومیں نہیں بلکہ قومیتیں کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یاد رکھئے، یہ قومیت کی اصطلاح محض فریب دہی ہے۔ ان میں عملاً کوئی فرق نہیں جو حیثیت ایک قوم کی ہوتی ہے وہی حیثیت ان قومیتوں کو دی جا رہی ہے عصرِ حاضر کی سیاسی تنظیم میں، ایک الگ قوم کے لئے الگ مملکت کا وجود ناگزیر ہوتا ہے۔ ہم نے اپنے لئے الگ مملکت (پاکستان) کا دعوےٰ منوایا ہی اس بنیاد پر تھا کہ ہم ایک الگ قوم ہیں۔ یہاں چار قومیتوں کی جو تفریق کی جا رہی ہے تو جس وقت اس تفریق کو تسلیم کر لیا گیا، چار جداگانہ مملکتوں کا دعویٰ مسلّم ہو جائے گا۔ اس دعوے کا آغاز ایک اور نگاہ فریب اصطلاح سے کیا جاتا ہے جسے "صوبجاتی خودمختاری" کہا جاتا ہے۔ ذرا اس لفظ "خودمختاری" جسے انگریزی زبان میں اٹانومی یا "سیلف ڈیٹرمی نیشن" کہا جاتا ہے، پر غور کیجئے۔ "خودمختار" کے معنی ہوئے وہ جسے اپنے معاملات طے کرنے کا پورا پورا اختیار حاصل ہو۔ اس قسم

کا اختیار مملکت کو تو حاصل ہو سکتا ہے، مملکت کی انتظامی وحدتوں کو کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ مغربی لباس سیاست کے مہرہ بازوں نے جب اپنے محکوم ممالک کو آزادی دی تو جاتے جاتے وہاں کچھ ایسے بیج بو گئے جن سے ان ممالک میں اندرونی استحکام پیدا ہی نہ ہو سکے۔ انہی میں ایک تصور "صوبجاتی خود مختاری" کا بھی ہے۔ مملکت، صوبوں کے اس مطالبہ کو مسترد نہیں کر سکتی کیونکہ یہ مطالبہ نظامِ جمہوریت کا لازمی جزو سمجھا جاتا ہے۔ اور انہیں اس قسم کے اختیارات دے بھی نہیں سکتی کہ اس سے خود مملکت کا وجود خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا، یہ مسئلہ مملکت اور اس کے صوبوں میں مستقل نزاع اور مخاصمت کا موجب بنا رہتا ہے اور اس طرح اس مملکت کا استحکام ختم ہو جاتا ہے۔ ہمارا چھوٹا سا ملک ہے جو اس وقت چار صوبوں میں بٹا ہوا ہے، اور مزید صوبے متشکل کر لینے کے مطالبات بھی آئے دن پیش ہوتے رہتے ہیں۔ "صوبجاتی خود مختاری" کی بنیاد پر مرکز اور صوبوں کے درمیان، اور پھر مختلف صوبوں کے مابین، جس قسم کا تزاحم و تخاصم اس وقت رونما ہو رہا ہے اس نے مملکت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ ون یونٹ کا قیام، وحدتِ مملکت کے بلند مقصد کی طرف ایک اچھا قدم تھا لیکن چونکہ اس کے بعد ملک میں وحدتِ امت پیدا کرنے کے لئے کچھ نہ کیا گیا، اور نہ ہی مرکز سے دور علاقوں میں رہنے والوں کے لئے انتظامی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں اس لئے اس سے بے اطمینانی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اس کا علاج ان نقائص کا دُور کرنا تھا۔ لیکن اس درد سر کو کون مول لیتا۔ عافیت اسی میں سمجھی گئی کہ اسے سرے سے ختم ہی کر دیا جائے۔ اسے ختم کیا تو صوبے پھر سے وجود میں آ گئے اور انہوں نے خود مختاری، کے مطالبات شروع کر دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک عملاً ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔ یہاں ایک قوم کی جگہ چار قومیتوں نے جنم لیا ہے اور ہر صوبہ اپنی خود مختاری کا مطالبہ کر رہا ہے۔

اسلامی مملکت میں تو خیر اس قسم کے مناقشوں اور رقابتوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کسی عام مملکت میں بھی اگر اس قسم کے باہمی تنازعات پیدا ہو جائیں تو وہ مملکت باقی نہیں رہ سکتی۔ مملکتِ پاکستان کو اگر باقی رکھنا مقصود ہے تو اس میں چار قومیتوں کے تصور اور صوبائی خود مختاری کے مطالبہ کو ختم کرنا ہوگا۔ ایک قوم کے اندر چار قومیتیں اور ایک مملکت کے اندر خود مختار وحدتیں، متضاد عناصر ہیں جو یک جا رہ نہیں سکتے۔ یہاں یا چار قومیتیں اور خود مختار وحدتیں رہ سکتی ہیں، یا ایک قوم اور ایک خود مختار مملکت۔ یہ فیصلہ یہاں کے رہنے والوں کے کرنے کا ہے کہ وہ ان میں سے کسے باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ اسلامی مملکت میں مختلف قومیتوں یا مختلف خود مختار وحدتوں کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں انتظامی مصالح کے پیشِ نظر مختلف دوائر قائم کئے جا سکتے ہیں لیکن ان کی حیثیت کمشنریوں کی سی ہو سکتی ہے۔ خود مختار صوبوں کی سی نہیں۔

۱۸۔ کلچر

الگ الگ قومیتوں کی بنیاد اس دعوے پر استوار کی جاتی ہے کہ یہاں مختلف کلچر ہیں اور ہر کلچر کا حامل گروہ ایک جداگانہ قومیت رکھتا ہے۔ کلچر کے متعلق اس سے زیادہ کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ ــــ ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا ــــ جو لوگ یہاں دن رات کا کلچر کلچر پکارتے رہتے ہیں آپ ان سے پوچھئے کہ کلچر ہوتا کیا ہے۔

اس کے جواب میں وہ ایسے مبہم الفاظ استعمال کریں گے اور ایسی بھانت بھانت کی بولیاں بولیں گے کہ آپ محوِ حیرت رہ جائیں گے۔ سمٹ سمٹا کر بات، موسیقی۔ رقص۔ ڈرامہ وغیرہ پہ آجائے گی۔ اکثر مغربی دانشور مجھے ملنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "پاکستانی کلچر" کے الفاظ سُن سُن کر ہمارے کان پک گئے اور بالآخر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں خود جا کر دیکھنا چاہیئے کہ وہ کلچر ہے کیا۔ ہم ہندوستان سے ہوتے ہوئے یہاں آئے۔ پہلے وہاں کا کلچر دیکھا جسے انہوں نے موسیقی۔ رقص، ڈرامہ وغیرہ کے رنگ میں پیش کیا۔ ہم یہاں آئے تو انہوں نے بھی اپنے کلچر کے مظاہر موسیقی۔ رقص۔ ڈرامہ کی شکل میں پیش کئے جو بعینہٖ وہی تھے جنہیں ہم بھارت میں دیکھ کر آئے تھے اس فرق کے ساتھ کہ وہاں ان کا معیار یہاں کے مقابلہ میں بلند تھا۔ پھر یہ پاکستانی حضرات ہمیں موہن جوڈارو، ہڑپا اور ٹیکسلا لے گئے کہ وہاں پاکستانی کلچر کے مظاہر دکھائے جائیں۔ وہاں ہم نے جو کچھ دیکھا وہ وہی تھا جو ہم ہندوستان کے عجائب گھروں میں دیکھ آئے تھے۔ یہ کچھ کہنے کے بعد یہ دانشور مجھ سے پوچھا کرتے ہیں کہ ہمیں بتائیے کہ اسلامی کلچر کیا ہے اور اس کے بعد یہ کہ پاکستانی کلچر کون سا ہے۔

آپ برادرانِ عزیز! پاکستانی کلچر کے ان مدعیوں سے کہیئے کہ وہ دانشورانِ مغرب کے اس سوال کا جواب دیں اور بتائیں کہ پاکستانی کلچر کون سا ہے؛ اور اس کے بعد یہ کہ آپ جو پاکستان کی مختلف قومیتوں کا مختلف کلچر بتاتے ہیں، اس کلچر کی نوعیت کیا ہے؟

پہلے تو اس حقیقت کو یاد رکھئے کہ کلچر کا جو تصور عام طور پر پیش کیا جاتا ہے اس کی رو سے اسلامی کلچر کوئی شے نہیں۔ اسلام زندگی کی مختلف اقدار اور غیر متبدل اصول دیتا ہے اور ان کی پابندی کو وہ اسلامی نہج زندگی قرار دیتا ہے۔ ان اقدار اور اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے، ہر ملک کے باشندوں کو آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جس قسم کا رہن سہن جی چاہے اختیار کریں۔ یہ انداز بود و ماند مختلف ممالک کے مسلمانوں کا مختلف ہو سکتا ہے۔ اگر اس کا نام کلچر ہے تو اسے اسلامی کلچر نہیں کہا جا سکے گا۔ البتہ اگر یہ کہا جائے کہ جن فنونِ لطیفہ یا ادب وغیرہ میں اسلامی اقدار کی روح جھلکتی نظر آجائے، انہیں اسلامی کلچر کا مظہر قرار دیا جائے گا، تو اس قسم کا کلچر بہ حیثیت مجموعی آج کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ اسلامی اقدار کی روح، اثباتِ حیات (SAYING YES TO LIFE) ہے اور یہ روح، مذہب میں آکر مفلوج بلکہ مصلوب ہو جاتی ہے۔ لہٰذا، جب تک اسلام، پھر سے دین کی شکل اختیار نہیں کرتا، اسلامی اقدار کی روح کی نمود نہیں ہو سکتی۔ باقی رہے موہن جوڈارو، ہڑپہ، ٹیکسلا، سو اتفاق سے یہ علاقے پاکستان کی حدود کے اندر آگئے ہیں۔ ان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لہٰذا، انہیں پاکستانی کلچر کا مظہر قرار دینا، حقیقت کا منہ چڑانا ہے۔ تقسیم کے نتیجہ میں اگر وہ بھارت کی حدود کے اندر چلے جاتے، تو ان کا کلچر، بھارتی کلچر قرار پا جاتا۔

میں، بہر حال، کہہ رہا تھا کہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں رہنے والوں کے انداز بود و ماند کو کلچر قرار دینا پھر کلچروں کے اس اختلاف کی بنیاد پہ انہیں مختلف قومیتوں میں تقسیم کرنا۔ اور پھر ہر قومیت کا الگ الگ وجود تسلیم کروانا۔ پاکستان میں تشتت، انتشار اور اختلاف اور فساد برپا کرنے کی بڑی گہری اور خطرناک سازش ہے جس کے پیچھے جذبۂ محرکہ یہی ہے کہ اس مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ آپ اسلامی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتے

ہیں تو، طرزِ بود و ماند تو ایک طرف، وہ خون، رنگ، نسل، زبان، وطن کے اختلاف کی بنا پر بھی اُمت میں کسی قسم کی تفریق کی اجازت نہیں دیتا۔ وہاں عشرتِ قطرہ دریا میں جذب ہو جانے کا نام ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے۔ قرآن کریم نے شعوب اور قبائل (خاندانوں اور قبیلوں) کو وجہِ تعارف قرار دیا تھا کیونکہ اُس زمانے میں بالخصوص صحرا نشینوں کی زندگی میں، باہمی تعارف کی کوئی اور علامت نہیں تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ دیکھنا! یہ قبائلی اور خاندانی تعارف کہیں وجہِ تکریم اور باعثِ تفریق نہ بن جائے۔ اب اگر انہی علاقائی علامات اور ان کے اندازِ بود و ماند کو کلچر کی اصطلاح سے تعبیر کر کے، امت میں تفریق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی، تو میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ زمانہ قبل از اسلام کے بتوں کو از سرِ نو حریمِ کعبہ میں لا کر بسانے کے مرادف ہوگا۔ یاد رکھیئے۔ صبغۃ اللہ (اللہ کا رنگ) یعنی انفرادی طور پر اپنی ذات میں اور اجتماعی طور پر معاشرہ میں صفاتِ خداوندی کی (علیٰ حد البشریت) نمود مسلمانوں کا کلچر ہوتا ہے۔ اسلام ان کی قومیت، اور تمام روئے زمین ان کا وطن۔ وَذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔

حرفِ آخر

یہ ہیں، عزیزانِ من! چند ایک مثالیں ان اصطلاحات کی جنہیں ہم مسلسل اور متواتر استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں لیکن جن کا متعین مفہوم اور عملی مقصود کسی کے سامنے نہیں۔ نتیجہ اس کا وہ ذہنی انتشار اور عملی خلفشار ہے جس میں قوم اس بُری طرح سے گرفتار ہے اور جو ہمیں دن بدن تباہی کے جہنم کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہا ہے۔ ان اصطلاحات کے جو مفاہیم میں نے پیش کئے ہیں، وہ ایسے واضح ہیں کہ ان کا سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ لیکن ان کے سمجھنے کے لئے ایک شرط ہے۔ اور وہ یہ کہ پہلے ذہن کو اُن تصورات اور مفاہیم سے خالی کر لیا جائے جو ہمارے ہاں متوارث چلے آ رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیئے

جب تک ذہن کے بتکدۂ تصورات کو ان اصنام سے پاک و صاف نہیں کیا جائے گا، صحیح اسلامی تصورات اس میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ پھر اقبالؒ ہی کے الفاظ میں:

کھو یا گیا جو مطلبِ ہفتاد و دو ملت میں
سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک

جب تک بے رنگی ادراک کے بعد ان مفاہیم کو سمجھا نہیں جائے گا، وحدتِ فکر پیدا نہیں ہو سکے گی۔ اور جب تک وحدتِ فکر پیدا نہیں ہوگی نہ امت میں وحدت پیدا ہو سکے گی، نہ (پاکستان میں تو ایک طرف) مسلمانوں کے کسی ملک میں اسلامی مملکت کی تشکیل کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔

اور یہ وحدتِ فکر صحیح تعلیم کی رو سے پیدا ہو سکے گی۔

والسلام

حقائق و عبر

۱۔ حیراں ہوں دِل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!

جوں جوں زمانے کی لہریں حقائق پر پڑے ہوئے (یا ڈالے ہوئے) پردے اٹھاتی جاتی ہیں، تحریکِ پاکستان کے دوران ہمارے خلاف کس کس قسم کی سازشیں ہوئی تھیں، وہ ابھر ابھر کر سامنے آتی جاتی ہیں۔ اور جوں جوں وہ سامنے آتی ہیں قائدِاعظم کی عظمت تابندہ سے تابندہ تر ہوتی جاتی ہے۔ آئیے کو تو اس سے پہلے بھی بہت سی سازشیں ہمارے سامنے آئیں، لیکن جس سرپرستانہ رازش کا اب انکشاف ہوا ہے اس سے تو (یقین مانئے) ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ تقسیمِ ہند کے مسئلہ کی گتھی کو سلجھانے کے لئے سب سے آخر لارڈ ماؤنٹ بیٹن آیا تھا۔ اور اس کے ساتھ اس کی بیوی۔ ایڈوینا (EDWINA) بھی تھی۔ نظر بظاہر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ یورپین ممالک کی بیویاں زندگی کے ہر شعبہ میں خاوندوں کے ساتھ رہتی ہیں اس لئے اس وقت اس طرف کسی کا خیال تک بھی نہیں جا سکتا تھا کہ یہ محترمہ کوئی خاص مشن لے کر آئی ہیں۔ عمر کے اعتبار سے وہ پینتالیس سال کی تھی لیکن اس کے حسن و جمال، اس کی رعنائیوں اور دلربائیوں، اس کی عشوہ بازیوں اور سحر طرازیوں کے چرچے عام تھے۔ اور یہی تھے وہ ریشمیں جال جنہیں اپنے ساتھ لے کر وہ انڈیا آئی تھی۔ اس کا کسی کو پتہ ہی نہ چلتا اگر (RICHARD HOUGH) کی مرتب کردہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سوانح عمری (MOUNTBATTEN: HERO OF OUR TIME) شائع نہ ہوتی۔ اس میں اس جادوگری کے حیرت انگیز کرتب سامنے آئے ہیں۔ اس میں لکھا ہے:۔

اس زمانے میں جب ہندوستانی عورتوں کا سیاست میں کچھ نمایاں عمل دخل نہیں ہوتا تھا، مسئلہ تقسیمِ ہند کی گفت و شنید کے لئے جو (انگریز) ارباب حل و عقد یہاں آئے تھے ان کی بیویوں نے اس باب میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس میں سرِفہرست۔ ایڈوینا تھی۔ اس کی سحر طرازیوں کا اوّلین ہدف جواہر لعل نہرو تھا۔ وہ تنہا تھا اور ایک عورت کی رفاقت سے محرومی کو شدت سے محسوس کرتا تھا۔ (ایڈوینا نے اس راز کو بہت جلد پا لیا) یوں تو اس ساحرہ نے ہندوستان کے سب لیڈروں کو مسحور کیا لیکن نہرو کے ساتھ اس کے تعلقات بڑے گہرے ہو گئے۔ اگرچہ اکثر لوگوں کو اس کا علم بھی ہو گیا اور شبہ تو بہت سوں کو تھا لیکن اس سے اس کے مقام (STATUS) میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ نتیجہ بلکہ اس کے برعکس برآمد ہوا۔ ان کے ان تعلقات نے انتقالِ اقتدار کے مسئلہ پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ماؤنٹ بیٹن کو یہ سب کچھ معلوم تھا لیکن اس کا اس نے قطعاً بُرا نہ منایا۔ اس کے برعکس وہ اس پر فخر کرتا تھا اور اپنی بیوی کو اس کی داد دیتا تھا اور اس سے کہتا تھا کہ تم نے کمال کر دکھایا! اسے بھی پیشِ نظر رکھئے کہ ایڈوینا کی رگوں میں یہودی خون بھی تھا۔

گاندھی بھی اس ساحرہ کے جادو سے متاثر ہو گیا اور بہت جلد اسے "میری پیاری دوست" کہنے لگ گیا،

اگرچہ ایڈوینا کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت نہرو کے ساتھ اس کے تعلقات سے مختلف تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا اور ایک ہی نشست میں گاندھی کو رام کر لیا۔

آپ اس جادوگرنی کے "حصار" سے باہر نکل آئیے اور انتہائی فخر و مباہات سے (HOUGH) کے اس اعتراف کو پڑھیے کہ

اس سارے ہجوم میں اگر کسی پر اس ساحرہ کے جادو کا کوئی اثر نہ ہوا تو وہ قائد اعظم محمد علی جناح تھا ــــ رحمۃ اللہ تعالیٰ

اس کے بعد مصنف لکھتا ہے کہ لارڈ بٹلر نے (جو کسی زمانے میں وزیر ہند رہ چکا تھا) کہا ہے کہ

> ماؤنٹ بیٹن جناح کے متعلق صحیح اندازہ لگا ہی نہیں سکا۔ یہ اس کی بڑی غلطی تھی۔ اصل یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکا۔ ہاں تھا کہ ماؤنٹ بیٹن نے نہرو اور گاندھی کے ساتھ جس قسم کے تعلقات وابستہ کر لئے تھے جناح انہیں کس قدر ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ (ہمیں ان امور کا صحیح صحیح اندازہ کرنا چاہیئے تھا کیونکہ) جناح وہ واحد شخص تھا جس کے ہاتھ میں ہندوستان کے مستقبل کی کلید تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا تھا کہ اس نے جناح کے ساتھ بھی وہی حربے استعمال کرنے چاہے جن سے اس نے گاندھی اور نہرو کو رام کر لیا تھا لیکن وہ اس میں یکسر ناکام رہا۔ جناح میں قطعاً لچک نہیں تھی۔ اس کا ایک ہی خواب تھا۔ اور وہ تھا ایک جداگانہ مسلم سٹیٹ کا قیام۔ تقسیم سے متعلق گفتگو کی مجالس میں وہ آتا تو ایک لفظ کہے بغیر محض اس کی آمد سے تمام شرکائے محفل پر سکتہ طاری ہو جاتا ــــ اپنے اصولوں کا پکا۔ قطعاً نہ جھکنے والا۔ اس سے بات کرنا آسان کام نہیں تھا (بالآخر ہمیں اس کے سامنے جھکنا پڑا)۔

ہم نے یہ معلومات پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۸۰ء (جس میں مذکورہ بالا کتاب کا ایک پورا باب شائع ہوا ہے) اور روزنامہ مشرق کراچی کی اشاعت بابت ۱۴ ستمبر ۱۹۸۰ء سے اخذ کی ہیں جس میں اس کتاب کے ضروری اقتباسات شائع ہوئے ہیں۔

یہ تھا تو درِ دل۔ اب آئیے سوزِ جگر کی طرف۔ تقسیم ہند کا اصول طے ہو جانے کے بعد فیصلہ یہ تھا کہ عملاً تقسیم اگست ۱۹۴۸ء میں ہو گی۔ اس سے کم از کم اتنا وقت مل جاتا کہ تقسیم کے ضمن اور اس کے عواقب میں پیدا ہونے والے مسائل کو غور و خوض اور سکون و اطمینان کے ساتھ طے کر لیا جاتا۔ لیکن اس کے بعد یکایک یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ تقسیم ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو عمل میں آ جائے گی۔ اس سے جو افراتفری مچی اور پاکستان کو جس قدر نقصان پہنچا وہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی جس قدر قتل و غارت گری ہوئی اس میں بڑا حصہ اس عاجلانہ تقسیم کا بھی تھا۔ اس وقت کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ اس عجلت کی بالآخر وجہ کیا ہے۔ یہ راز اب جا کر کھلا ہے۔

حکومت برطانیہ کی طرف سے (سرکاری طور پر) وہ دستاویزات شائع ہو رہی ہیں جن کا تعلق تقسیم ہند سے تھا اور جنہیں اس زمانے میں مخفی رکھا گیا تھا۔ حال ہی میں اس سلسلہ کی نویں جلد (VOL. 9) شائع ہوئی ہے جس کے کچھ اقتباسات روزنامہ ڈان کی ۲۰ ستمبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں کہا گیا ہے کہ جب حکومت برطانیہ، تقسیم ہند کی گتھی سلجھانے میں ناکام ہو گئی تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ نہرو اور جناح پر امریکہ کی طرف سے دباؤ ڈلوانا چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ امریکہ کو کیا پڑی تھی کہ وہ پرائی آگ میں اپنا سر دیتا۔ اسے اس مسئلہ میں دلچسپی کیا ہو سکتی تھی؟ اس راز کا انکشاف لارڈ ویول کے ایک نہایت خفیہ خط میں کیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ امریکہ کو معلوم تھا کہ ٹراونکور (انڈیا) میں (MONAZITE - SANDS) کے ذخائر ہیں جو ایٹمی توانائی کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور فلاں میں تیل کے کنوئیں ہیں۔ اسے خطرہ

ہے کہ اگر ہندی سیاست کا مسئلہ جلدی حل نہ ہوا تو روس اپنا اثر استعمال کرنے کے لئے بڑھ آئے گا، اس لئے ضروری ہے کہ اس مسئلہ کو جلد از جلد حل کر لیا جائے۔ چنانچہ اس کے لئے ایک مفصل اسکیم تیار کی گئی۔ امریکی نمائندگان نے نہرو سے سلسلۂ گفتگو شروع بھی کر دیا۔ لیکن جناح کے ساتھ براہِ راست بات کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کی بجائے مسٹر لیاقت علی خاں سے بات کی گئی۔ ان کا ردِ عمل کیا تھا اس کا واضح ذکر نہیں کیا گیا۔

بہرحال یہ امریکہ کا دباؤ تھا جس کی وجہ سے ملک کی عملی تقسیم کے سلسلہ میں اس قدر عجلت سے کام لیا گیا۔ کیا معلوم اس کے صلہ میں امریکہ نے بھارت کو کیا کیا مراعات دیں یا دینے کا وعدہ کیا!

یہ تھیں دردِ خانہ وہ سازشیں جو تقسیم کے سلسلہ میں ہمارے خلاف ہو رہی تھیں۔

بہر یک نخچیر، صد نخچیر گیر
ایک پرندہ، سو شکاری!

یہ تو اُس میرِ کارواں کا تدبر، فراست اور دیانت تھی جو اس کے باوجود ہم زندہ بھی رہے اور بچ بھی گئے۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے

جس طرح وہ ہمیں رہزنوں کے ہاتھوں سے بچا کر لے آیا تھا، اے کاش، وہ ہمیں رہبروں کے ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی کچھ عرصہ اور زندہ رہتا!

۲۔ اگر ہمت ہو تو اس خبر کو پڑھئے!

یہ انسانیت سوز واقعہ ہے گوجرہ شہر کے محلہ بیس لائن کا، اور دن وہ ہے جب فیصل آباد کا ضلع طوفانِ باد و باراں کی لپیٹ میں آیا تھا۔

ایک سولہ سالہ لڑکی، نذیراں بی بی، اپنے بھائی کو کھانا دے کر واپس گھر آ رہی تھی کہ اس پر یکایک قریب ایک درجن آوارہ کتوں نے حملہ کر دیا۔ وہ بے چاری بہتیری چیخی چلائی لیکن کوئی اس کی مدد کو نہ پہنچا۔ چند لمحوں میں، ان کتوں نے اس کا سارا گوشت کھا لیا اور صرف اس کی ہڈیاں باقی رہ گئیں!

(روزنامہ دی مسلم۔ اسلام آباد۔ مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۸۰ء)

یہ قیامت خیز، لرزہ انگیز، جگر پاش واقعہ کسی جنگل میں پیش نہیں آیا۔ بھری بستی کے ایک آباد محلے میں پیش آیا!

معلوم نہیں کہنے والے نے یہ بات کس احساس کے تابع کہی تھی کہ ——— سنگہا را بستند و سگاں را وا رہانند ——— (پتھروں کو باندھ دیتے ہیں اور کتوں کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں)۔ معلوم نہ تھا کہ یہ محض محاورہ نہیں۔ انسانی دنیا میں بھی ایسا ہوتا ہے۔

اس جانکاہ واقعہ کا سب سے زیادہ الم انگیز پہلو یہ ہے کہ اس کے خلاف کسی گوشہ سے بھی صدائے احتجاج بلند نہ ہوئی۔ انسانی جان کی اس قدر ارزانی! اس کے بعد ہم تحقیقاتی کمیشن بٹھاتے ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہم پر خدا کا عذاب کیوں نازل ہو رہا ہے!

۳ ہماری برآمدات

بیورو آف امیگریشن اینڈ اوورسیز ایمپلائمنٹ کے ڈائرکٹر جنرل، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) محمد اکبر نے اسلام آباد کے روزنامہ 'دی مسلم' کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ اس وقت پاکستان کی افرادی برآمد (MAN POWER EXPORT) قریب بارہ ہزار ماہوار ہے۔ ۱۹۸۱ء کا ہدف دو لاکھ اور ۱۹۸۲ء کا دو لاکھ پچاس ہزار ہے۔ اس رفتار کی رو سے اندازہ ہے کہ ۱۹۸۵ء تک یہ تعداد دس لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ اس وقت اس زرمبادلہ کی مقدار، جو یہ لوگ پاکستان بھیجتے ہیں، دو سو چالیس کروڑ ڈالر تک پہنچ جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ یہ افواہ بے بنیاد ہے کہ اس افرادی برآمد کی رفتار کچھ سست پڑ گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نئی منڈیوں کی تلاش میں ہیں۔ (مثلاً) مشرقِ وسطیٰ کا ایک ملک تیس لاکھ سے زائد افراد درآمد کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمیں اس میں سے قریب ایک تہائی تک کا آرڈر مل جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا یہ بزنس نہایت عمدگی سے (SMOOTHLY) چل رہا ہے۔ اس سال، ان برآمد کردہ کارکنوں نے ایک سو ساٹھ کروڑ سے زائد ڈالرز پاکستان بھیجے ہیں۔ (دی مسلم۔ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۸۰ء)

(۰)

۴۔ اسلحہ یا روٹی

اخبارات میں ہمارے ہمسایہ ملک (بھارت) کے ان اخراجات کے اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں جو وہ اپنے دفاعی منصوبوں پر صرف کر رہا ہے۔ بتایا یہ گیا ہے کہ اس وقت تک وہ (۴۵،۰۰) کروڑ روپے، اسلحہ سازی، اسلحہ کی خرید اور دیگر فوجی امور پر صرف کر رہا ہے۔ اور جب اس کا حالیہ منصوبہ پروان چڑھے گا، تو یہ رقم (۱۱،۰۰۰) کروڑ روپے تک پہنچ جائے گی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، وہیں کے ایک اخبار ——— المدینہ ——— نے لکھا ہے:۔

> فطری طور پر یہ حکومتِ ہند کا حق ہے (یعنی اسے اس کا اختیار حاصل ہے) کہ وہ فیصلہ کرے کہ وہ اربوں ڈالر، انسانوں کو ہلاک کرنے والے ہتھیاروں کے ذخیرہ کرنے پر صرف کریگی۔ یا اپنے ان لاکھوں، کروڑوں، بھوکے ننگے غریبوں، محتاجوں کے مصائب کم کرنے پر۔ جو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر ہندوستان نے اسلحہ کو ترجیح دی تو اس کا جوابِ عمل اس منطقہ میں بسنے والے دیگر ممالک کی طرف سے ہوگا، وہ ظاہر ہے۔ (یعنی وہ بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق اس دوڑ میں لگ جائیں گے ——— پھر غریبوں مفلسوں کا خدا حافظ!)
>
> پاکستان ٹائمز۔ ۲۰ اگست ۱۹۸۰ء)

سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ انسان، تہذیب و تمدن کے غازہ سے اپنے چہرے کے حقیقی خط و خال کو ہزار چھپانے کی کوشش کرے۔ لیکن

دیدم چو جنگ پردۂ ناموسِ او درید! — مجز "یسفک الدماء" و "خصیم مبین" نبود

اور اس لئے کہ

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے — قیامت ہے کہ انسان نوعِ انساں کا شکاری ہے

جب تک نوعِ انسان، قومیتوں کے دائروں میں بٹی رہے گی، جنگ اور فساد کا سلسلہ ختم نہیں ہو گا۔ اس کا علاج (قرآن کی تجویز کردہ بنیادوں پر) نوعِ انسان کی عالمگیر برادری یا اُمتِ واحدہ کی تشکیل ہے۔

(۰)

۵۔ ختمِ نبوّت کی شہادتیں

ماہنامہ شمس الاسلام (بھیرہ) کی اشاعت بابت اگست، ستمبر ۱۹۸۶ء میں ختمِ نبوت کے عنوان سے مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کے آخر میں انہوں نے اس عقیدہ کی شہادت میں دو ایک واقعات پیش کئے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

مُردہ کی شہادت

اس سلسلہ میں ایک حیرت انگیز اور سبق آموز واقعہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حضرت نعمان بن بشیر فرماتے ہیں کہ

زید ابن خارجہ انصار کے سرداروں میں سے تھے۔ ایک روز وہ مدینہ طیبہ کے بازاروں میں پیدل چل رہے تھے کہ یکایک زمین پر گر پڑے اور فوراً وفات پا گئے۔ انصار کو اس کی خبر ہوئی تو ان کو وہاں سے اٹھایا۔ اور گھر لائے، اور چاروں طرف سے ڈھانپ دیا۔ گھر میں کچھ انصاری عورتیں تھیں۔ جو ان کی وفات پر گریہ زاری میں مبتلا تھیں۔ اور کچھ مرد جمع تھے۔ اس طرح پر جب مغرب و عشاء کا درمیانی وقت آیا تو اچانک ایک آواز سُنی گئی کہ

"چُپ رہو! چُپ رہو"۔

لوگوں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ آواز اسی چادر کے نیچے سے آ رہی ہے۔ جس میں میت ہے۔ یہ دیکھ کر لوگوں نے ان کا منہ کھول دیا۔ اس وقت دیکھا کہ زید ابن خارجہ کی زبان سے کہنے والا یہ کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ النبی الامی خاتم النبیین لا نبی بعدہ کان ذلک فی الکتاب الاول صدق صدق صدق صدق۔ یعنی محمد اللہ کے رسول ہیں اور نبی اُمّی ہیں۔ جو انبیاءؑ کے ختم کرنے والے ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ یہی مضمون کتاب الاوّل یعنی توریت و انجیل وغیرہ میں موجود ہے۔ سچ کہا۔ سچ کہا۔ (ختم نبوت فی الآثار)

جنگلی جانوروں کی شہادت

یہاں ایک اور بصیرت آموز اور عبرت انگیز واقعہ بھی سُن لیجئے۔ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے بیہقی طبرانی اوسط طبرانی۔ صغیر ابنِ عدی حاکم۔ ابو نعیم ابنِ عساکر۔ خصائص کبریٰ سیوطی جلد ۲ صفحہ ۶۵ میں ایک روایت منقول ہے کہ آنحضرت نے ایک اعرابی کو دعوتِ اسلام دی تو اس نے کہا جب تک یہ "گوہ" آپ پر ایمان نہ لائے، میں آپ

پر ایمان نہ لاؤں گا۔ آپ نے گوہ سے خطاب فرمایا کہ "بتلا میں کون ہوں"۔ گوہ نے نہایت بلیغ عربی زبان میں جس کو ساری مجلس سُنتی تھی، کہا: "لبیک وسعدیک یا رسول اللہ رب العالمین" یعنی اے رب العالمین کے سچے رسول میں حاضر ہوں اور آپ کی اطاعت کرتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔"

آپ نے پھر فرمایا: "فمن انا قال انت رسول رب العالمین وخاتم النبیین" (ترجمہ) میں کون ہوں؟ گوہ نے جواب دیا کہ آپ پروردگار عالم کے سچے رسول ہیں اور انبیاء کے ختم کرنے والے ہیں۔"

اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ جس عقیدہ کی تائید میں اس قسم کی شہادات ہوں اس کے متعلق "اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ اسلام اور ایمان کے بنیادی مسائل وعقائد میں کوئی مسئلہ او رعقیدہ اس قدر زیادہ ظاہر و باہر، زیادہ واضح و مبرہن زیادہ روشن وتابناک اور زیادہ اجماعی اور متفق علیہ نہیں جس قدر مسئلہ ختم نبوت" (صفحہ ۳)

۶۔ پھر زمینے کہ رفتیم آسماں پیداست

جب روس میں کمیونزم کا آغاز ہوا تو ساری دنیا میں غلغلہ بلند ہوا کہ — آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا — اور چند دنوں کے بعد جب وہ "آفتاب تازہ" بھی غروب ہوگیا تو چین سے یہی نعرہ ابھرا اور سطح بین انسانوں کو یہ توقع بندھی کہ وہاں عدل وانصاف کا تخت اجلال بچھے گا۔ لیکن وہاں (خود ماؤ کے زمانے میں) کیا ہوا اس کا اندازہ ذیل کی رپورٹ سے لگائیے جو روزنامہ نوائے وقت کی ۴ ستمبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے:-

> چین کی اعلیٰ عدالت کے سربراہ نے کہا ہے کہ ثقافتی انقلاب کے دوران جن لوگوں کو سیاسی قیدی بنایا گیا ان میں سے دو تہائی بے گناہ ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ دو لاکھ ستر ہزار افراد پر انقلاب دشمنی اور دوسرے الزامات کے تحت مقدمات چلائے گئے مگر ایک لاکھ ستر ہزار افراد بے گناہ ثابت ہوئے۔ ان میں سے چھبیس ہزار افراد کو لیوشاؤ چی کی علیحدگی کے جوڑ توڑ میں پھنسایا گیا تھا۔ انہوں نے پیپلز کانگریس کو مطلع کیا کہ ملک میں آٹھ لاکھ ساٹھ ہزار فوجداری مقدمات میں سے سات لاکھ ساٹھ ہزار مقدمات کے غلط فیصلے کئے گئے۔

یہ سابقہ حکومت کے زمانے کی روئیداد ہے۔ جب موجودہ حکومت نہ ہوگی تو اسی قسم کی رپورٹیں ان کے متعلق شائع ہوں گی۔ دنیا میں ہر جگہ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری!

۷۔ سپاروں کے فیصلے

کوئی بزرگوار ہیں قاضی مجتسم۔ انہوں نے صدر پاکستان، جنرل ضیاء الحق کے نام ایک کھلا خط لکھا ہے جس کی سائیکلو سٹائیلڈ کاپی بغرض اشاعت ہمیں بھی بھیجی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

"ملک میں ان دنوں نظام حکومت کیسا ہونا چاہئیے؟ کے عنوان سے بحث جاری ہے جس میں سیاسی و مذہبی رہنما اور نامور قانون دانوں نے حصہ لیا ہے اور بہت لوگ بھی اس دلچسپ اور اہم بحث میں ضرور حصہ لیں گے۔

اکثر سیاستدان اور علماء نے پارلیمانی طرز حکومت بعض نے صدارتی طرز انتظام کی طرف داری کی ہے۔ ۱۹۷۳ء کے

آئین کی صرف حمایت ہی نہیں بلکہ پوجا کی گئی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی طرزِ حکومت کو سب نے طاق میں اٹھا رکھا۔

بحیثیت منجم اور پاکستانی شہری مجھ پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ افلاک پر نظر ڈالوں ستاروں کی چال کو پڑھوں پھر اپنی رائے سے اپنے ہم وطنوں اور راہنماؤں کو آگاہ کروں۔ چنانچہ میں نے علمِ نجوم کے حوالے سے سوچا پڑھا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ پاکستان میں کسی قسم کا بھی مغربی طرزِ حکومت رائج نہیں ہوگا۔ آئین ۱۹۷۳ء جیسا مغربی فلسفہ اب پاکستان میں دفن کر دیا ہے جو کبھی زندہ نہ ہوگی۔ یہی بات میں گزشتہ بارہ برس سے کہہ رہا ہوں کیونکہ سیاروں کے فیصلے حسبِ ذیل ہیں: سیارگان بتاتے ہیں کہ

۱۔ حکومت کو نمائندوں کے لئے معیارِ قابلیت مقرر کرنا ہوگا۔

۲۔ نمائندوں کے اعمال و کردار نظریات اور قومی خدمات کا احاطہ کرنے کے لئے بھی معیار مقرر کرنا ہوگا۔

۳۔ اس کے بعد حکومت ضلع وار نمائندوں کے لئے قرعہ اندازی کرائے۔

۴۔ اس کے بعد صوبائی نمائندوں کے لئے قرعہ اندازی کرائے۔

۵۔ صوبوں کے بعد مرکز کے نمائندوں کے لئے بھی قرعہ اندازی ہو یعنی پارلیمنٹ کے ارکان بھی قرعہ اندازی کے ذریعے چنے جائیں۔

جو اشخاص ہر معیار اور حدود سے پورا اتر کر آئیں ہوں گے وہ اسلامی اصولوں کے مطابق آئین تیار کریں تو وہ آئینِ پاکستان کے لئے کارآمد ہوگا۔ انشاء اللہ

میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح عازمین حج بیت اللہ کے لئے قرعہ اندازی ہوتی ہے بعینہٖ قومی، صوبائی اور ضلعی اداروں کے لئے بھی کرائی جائے۔ اسلام کی رو سے قرعہ اندازی جائز ہے۔ حضرت یونسؑ کو بھی قرعہ اندازی ہی کے ذریعہ دریا میں پھینکا گیا تھا۔

رہا معاملہ وزراء کا، وزیر تنخواہ دار ملازم ہوں جو نچلی سطح سے اپنی اعلیٰ کارکردگی کی بناء پر ترقی کرتے کرتے سیکرٹری جیسے عہدوں پر پہنچیں۔ وزیر بننے کا حق صرف انہیں کو ہو۔ کیونکہ وزیر ملازم کی حیثیت سے ہوں گے اس لئے وہ اپنے ماضی کی نیک نامی کو داغ لگنے نہ دیں گے اور اچھے انسانوں کی طرح اچھی خدمتِ قوم کریں گے اور ماضی کی طرح "زر کے زور سے" کسی ناتجربہ کار زید بکر کو وزیر بننے کا قطعی موقع نہ ملے گا۔"

جب کسی قوم پر سوچ کے دروازے بند ہو جائیں تو وہ اس قسم کی توہم پرستیوں کی شکار ہو جاتی ہے۔ رمل، نجوم، قرعے، فالیں وغیرہ اس کے فیصلوں کے مدار قرار پا جاتے ہیں۔ یا (منجم کے حوالے سے) یوں سمجھئے کہ جب صاحبِ اختیار و ارادہ انسان اپنے معاملات کے فیصلے آپ کرنے سے معذور ہو جائے تو آسمان کے مجبور و مجہول (بلکہ اقبالؒ کے الفاظ میں ——— فراخیٔ افلاک میں خوار و زبوں) ستارے اس کے مقدر کے فیصلے کرنے کے لئے آسمان سے اترتے ہیں۔ اور یہ مقام اس قوم کی تباہی کی آخری علامت ہوتا ہے۔

ایک خبر: مسلم عائلی قوانین منسوخ کئے جا رہے ہیں۔ (روزنامہ مسلم، مؤرخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۰ء)

میری میناے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی (اقبالؒ)

فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

(۱۹ر اگست تا ۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۰ء)

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۱۔ خلیل ملک صاحب بذریعہ ونگ کمانڈر رضا صاحب معرفت بزم طلوعِ اسلام، لندن	۱۰۰۰/-	۳۵۵۶
۲۔ پرنس عابد علی صاحب معرفت بزم طلوعِ اسلام، کوئٹہ	۱۰۰/-	۳۵۵۷
۳۔ مسلمی عبدالغفور صاحب 〃 〃 〃 〃	۵۰/-	۳۵۵۸
۴۔ مسعود حسن صاحب 〃 〃 〃 〃	۲۰/-	۳۵۵۹
۵۔ شاہد محمود صاحب کینیڈا معرفت بزم طلوعِ اسلام، کمالیہ	۴۰۰/-	۳۵۶۰
۶۔ محمد اسلم خان صاحب معرفت بزم طلوعِ اسلام۔ مردان	۱۰/-	۳۵۶۱
۷۔ ڈاکٹر ملک محمد حسین صاحب معرفت بزم طلوعِ اسلام۔ ملتان	۱۰۰/-	۳۵۶۲
۸۔ مقرب خان صاحب معرفت بزم طلوعِ اسلام، راولپنڈی	۵۰۰/-	۳۵۶۳
۹۔ چوہدری برکت علی صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۱۵۰/-	۳۵۶۴
۱۰۔ ملک ظہور احمد صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۱۰۰/-	۳۵۶۵
۱۱۔ چوہدری عبدالحمید صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۱۰۰/-	۳۵۶۶
۱۲۔ ملک محمد سلیم صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۱۰۰/-	۳۵۶۷
۱۳۔ ریاض احمد قریشی صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۱۰/-	۳۵۶۸
۱۴۔ میاں محمد امجد صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۱۰/-	۳۵۶۹
۱۵۔ سلطان محی الدین صاحب۔ کراچی	۴۵۰/-	۳۵۷۰
۱۶۔ محمد امین خان صاحب۔ حیدرآباد	۵۰/-	۳۵۷۱
۱۷۔ بزم طلوعِ اسلام۔ پنج کسّی	۲۵۰/-	۳۵۷۲
۱۸۔ محمد حسین صاحب۔ گوئینکی (سیالکوٹ)	۲۰/-	۳۵۷۳
۱۹۔ مسز ظفر سعید صاحبہ۔ سیالکوٹ	۳۰۰/-	۳۵۷۴
۲۰۔ ڈاکٹر ارشد صاحب۔ (مریدکے)	۱۰۰/-	۳۵۷۵
۲۱۔ سید امیر حسین شاہ صاحب۔ معرفت بزم طلوعِ اسلام۔ سید حسین	۵۰۰/-	۳۵۷۶
۲۲۔ محمد سلیم خان صاحب معرفت بزم طلوعِ اسلام۔ لاہور	۵۰/-	۳۵۷۷

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۲۳۔ اللہ داد صاحب معرفت بزم طلوعِ اسلام، کوئٹہ	۱۰۰۰/-	۳۵۷۸
۲۴۔ نام اور پتہ ظاہر نہیں کیا	۱۰۰/-	۳۵۷۹
۲۵۔ محمد ارشاد صاحب۔ چارہان (مری)	۲۵/-	۳۵۸۰
۲۶۔ چوہدری عبدالکریم صاحب۔ ننکانہ صاحب	۵۰/-	۳۵۸۱
۲۷۔ مختلف ممالک کے احباب معرفت محمد یوسف بٹ صاحب۔ مدینہ منورہ	۱۷۷۷/-	۳۵۸۲ تا ۳۵۸۷
۲۸۔ بزم طلوعِ اسلام۔ لاہور چھاؤنی	۵۰۰/-	۳۵۸۸
۲۹۔ مسز لے خان۔ بحرین	۲۵۸/-	۳۵۸۹
۳۰۔ عین الحق صاحب۔ بریڈفورڈ معرفت رشید احمد بٹ صاحب، بریڈفورڈ	۲۲۷/-	۳۵۹۰
۳۱۔ محمد اکرم زرگر صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۲۰۴/-	۳۵۹۱
۳۲۔ نثار احمد صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۲۳/-	۳۵۹۲
۳۳۔ بیگم رشید احمد صاحبہ 〃 〃 〃 〃 〃	۸۹۴/-	۳۵۹۳
۳۴۔ نام اور پتہ ظاہر نہیں کیا	۵۰/-	۳۵۹۴
۳۵۔ ملک حنیف وجدانی صاحب۔ مری	۵۰/-	۳۵۹۵
۳۶۔ محمد صدیق صاحب (لاہور) معرفت بزم طلوعِ اسلام۔ لاہور	۱۰۰/-	۳۵۹۶
۳۷۔ احباب کویت معرفت محمد عمر دراز خان صاحب، کویت	۴۰۰۰/-	۳۵۹۷
۳۸۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃	۳۰۰۰/-	۳۵۹۸
۳۹۔ عبدالواحد رائی صاحب گوٹھ (ڈیپا آباد رنواب شاہ)	۳۰۰/-	۳۵۹۹
۴۰۔ نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے (دہران ایئرپورٹ)	۱۲۸۳/-	۳۶۰۰
۴۱۔ محترمہ مسز حفیظ قاضی صاحبہ بذریعہ ایم اے لطیف صاحب۔ کراچی	۲۵۰/-	۳۶۰۱
۴۲۔ محمد جاوید صاحب معرفت بزم طلوعِ اسلام، فیصل آباد	۱۰۰/-	۳۶۰۲
۴۳۔ محمد جمیل صاحب 〃 〃 〃 〃	۵۰/-	۳۶۰۳
۴۴۔ عبدالغفور صاحب 〃 〃 〃 〃	۱۰/-	۳۶۰۴

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۴۵۔ محمد یٰسین صاحب معرفت بزم طلوعِ اسلام فیصل آباد	۱۰/-	۳۶۰۵
۴۶۔ محمد سرفراز صاحب " " " " "	۵/-	۳۶۰۶
۴۷۔ ظفر علی صاحب " " " " "	۵۰/-	۳۶۰۷
۴۸۔ محمد فیاض صاحب " " " " "	۳/-	۳۶۰۸
۴۹۔ خان سعد اللہ خان صاحب " " " " "	۱۰۰/-	۳۶۰۹
۵۰۔ غلام رسول سلیمی صاحب " " " " "	۱۰/-	۳۶۱۰
۵۱۔ عبداللطیف بھٹی صاحب " " " " "	۵۰/-	۳۶۱۱
۵۲۔ ڈاکٹر محمد حیات ملک صاحب (نائنیرہ) " " " "	۵۰۰/-	۳۶۱۲
۵۳۔ قاضی محمد یوسف صاحب۔ چونترا (راولپنڈی)	۵۰/-	۳۶۱۳
۵۴۔ عبدالرشید بھٹی صاحب۔ مورگہ (راولپنڈی)	۱۰۰/-	۳۶۱۴
۵۵۔ خالد فاروقی صاحب معتمد بزم طلوعِ اسلام۔ لاہور	۵۰/-	۳۶۱۵
۵۶۔ سید اشرف الدین صاحب (لندن) معرفت سید مشرف الدین صاحب۔ اسلام آباد	۷۵/-	۳۶۱۶
۵۷۔ ایم۔ ایس۔ نواز صاحب۔ لورپول (انگلینڈ)	۵۸۵/-	۳۶۱۷
۵۸۔ مسز عبداللہ جمال صاحبہ۔ لاہور	۱۰۰/-	۳۶۱۸
۵۹۔ عبداللہ جمال مرحوم بذریعہ مسز عبداللہ جمال صاحبہ (لاہور)	۱۲۹۵/۱۲	۳۶۱۹
۶۰۔ مسز ظفر سعید صاحبہ۔ سیالکوٹ	۳۰/-	۳۶۲۰
۶۱۔ مس آر خان صاحبہ۔ بحرین	۳۵۸/-	۳۶۲۱
۶۲۔ نام اور پتہ ظاہر نہیں کیا	۱۰۰/-	۳۶۲۲
۶۳۔ چوہدری عبدالکریم صاحب (ننکانہ صاحب)	۵۰/-	۳۶۲۳
۶۴۔ بزم طلوعِ اسلام۔ لاہور چھاؤنی	۳۰۰/-	۳۶۲۴
۶۵۔ انجوی اینڈرسن (مانچسٹر) بذریعہ بشیر محمد خان صاحب معتمد بزم طلوعِ اسلام لندن	۱۱۶-۹۰	۳۶۲۵
۶۶۔ جاوید اقبال صاحب (ہڈرزفیلڈ) " " " " "	۱۰۱-۹۰	۳۶۲۶
۶۷۔ مسز انور رشید صاحبہ (پریسٹن) " " " " "	۱۱۶-۹۰	۳۶۲۷
۶۸۔ مسز یار بیرا خان صاحبہ (") " " " " "	۱۱۶-۹۰	۳۶۲۸
۶۹۔ مسز محمد یحییٰ یاسین صاحبہ (") " " " "	۲۳۳-۸۰	۳۶۲۹

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۷۰۔ مسٹر شریف صاحب (مانچسٹر) بذریعہ بشیر احمد خان صاحب معتمد بزم طلوعِ اسلام لندن	۱۱۶-۹۰	۳۶۳۰
۷۱۔ جی ایچ ٹیلیفینز (") " " " " " "	۲۳۳-۸۰	۳۶۳۱
۷۲۔ ایم جاوید صاحب (") " " " " " "	۱۱۶-۹۰	۳۶۳۲
۷۳۔ ایم اے ٹیلیفینز (") " " " " " "	۱۱۶-۹۰	۳۶۳۳
۷۴۔ کے سعید صاحب (") " " " " " "	۱۱۶-۹۰	۳۶۳۴
۷۵۔ منیر احمد صاحب (") " " " " " "	۱۱۶-۹۰	۳۶۳۵
۷۶۔ بشیر احمد خان صاحب ٹیلیفنز شے (شیفیلڈ) " " "	۳۴۶-۶۰	۳۶۳۶
۷۷۔ شفاعت خان صاحب (مانچسٹر) " " " " "	۱۱۶-۹۰	۳۶۳۷
۷۸۔ ایم اشرف صاحب (بریڈفورڈ) بذریعہ رشید محمد صاحب بریڈفورڈ معرفت بزم طلوعِ اسلام لندن	۱۱۶-۹۰	۳۶۳۸
۷۹۔ مسز اختری رشید صاحبہ (") " " " " " " "	۱۱۶-۹۰	۳۶۳۹
۸۰۔ ایس ایم نقوی صاحب (لندن) " " " " " "	۲۳۳-۸۰	۳۶۴۰
۸۱۔ اسحاق قاضی صاحب (بریڈفورڈ) " " " " " "	۲۳-۳۸	۳۶۴۱
۸۲۔ طارق علی صاحب (") " " " " " "	۲۳-۳۸	۳۶۴۲
۸۳۔ جاوید اشرف صاحب (") " " " " " "	۲۳-۳۸	۳۶۴۳
۸۴۔ اکرام الحق صاحب (") " " " " " "	۲۳-۳۸	۳۶۴۴
۸۵۔ ایم حنیف صاحب (") " " " " " "	۲۳-۳۸	۳۶۴۵
۸۶۔ نیاز علی صاحب (لندن) بذریعہ بینک کا ڈرافٹ معرفت بزم طلوعِ اسلام لندن	۱۱۶-۹۰	۳۶۴۶
۸۷۔ ایس اے بیکن لیورپول " " " " " " "	۱۱۶-۹۰	۳۶۴۷
۸۸۔ ایم اکرم صاحب (بریڈفورڈ) بذریعہ غلام احمد صاحب بریڈفورڈ معرفت بزم طلوعِ اسلام لندن	۴۶-۷۶	۳۶۴۸
۸۹۔ وقار اکرم صاحب (") " " " (") " " "	۲۳-۳۸	۳۶۴۹
۹۰۔ سی سویٹ سنٹر (") " " " (") " " "	۲۳-۳۸	۳۶۵۰
۹۱۔ حاجی صاحب لسبیلین (") " " (") " " "	۲۳-۳۸	۳۶۵۱
۹۲۔ ملک صاحب لسبیلین (") " " " (") " " "	۲۳-۳۸	۳۶۵۲
۹۳۔ اصغر علی صاحب موالے سٹریٹ (") " " " (") " " "	۲۳-۳۸	۳۶۵۳
۹۴۔ رحمی برادرز موالے سٹریٹ (") " " " (") " " "	۲۳-۳۸	۳۶۵۴
۹۵۔ مسز ملکی احمد صاحبہ " (") " " " (") " " "	۲۳-۳۸	۳۶۵۵
۹۶۔ شوکت محمود صاحب (ایلنگ لندن) بذریعہ روشن عباسی صاحب معرفت بزم طلوعِ اسلام لندن	۱۱۶-۹۰	۳۶۵۶

نقد و نظر

۱۔ دانائے راز

(سوانح حیات، حکیم الامت، علامہ اقبالؒ)

مرتبہ۔ سید نذیر نیازی ـــــ شائع کردہ۔ اقبالؒ اکادمی، پاکستان (لاہور) ـــــ ضخامت ساڑھے چار سو صفحات ـــــ طباعت ٹائپ ـــــ قیمت مجلد۔ مبلغ -/۵۶ روپے۔

ہمارے کانوں میں جب بھی کوئی ایسی خبر پڑی کہ محترم سید نذیر نیازی، علامہ اقبالؒ سے متعلق کچھ قلمبند فرما رہے ہیں، ہم ہمہ تن انتظار ہو گئے۔ اس لئے کہ مکانی اور ذہنی ہر دو اعتبار سے حضرت علامہ سے جس قدر قرب، نیازی صاحب کو رہا ہے، ہماری نگاہوں میں کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں جسے اس وقت ان کے مدِمقابل پیش کیا جا سکے۔ اس بنا پر، علامہ کے متعلق جو کچھ بھی نیازی صاحب سے مل سکے اسے ہم غنیمات میں سے سمجھتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے ہمیں معلوم ہوا کہ نیازی صاحب حضرت علامہؒ کی سوانح حیات مرتب فرما رہے ہیں اور وہ کتاب اقبالؒ اکاڈمی کی طرف سے شائع ہو گی۔ وقت گزرتا گیا لیکن اس کتاب کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ تا آنکہ اس کا ایک نسخہ خود نیازی صاحب کی کرم فرمائی سے ہمیں مل گیا۔ ان کے اس گراں بہا تحفہ کے لئے ہم ان کے بدلِ شکر گذار ہیں۔ آغازِ کتاب میں انہوں نے ان سنگلاخ وادیوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے انہیں اس کے لئے معلومات حاصل کرنے کے سلسلہ میں گزرنا پڑا، نیز ان صبر آزما مراحل کا جن سے بفرضِ اشاعت ان کی یہ کاوش گذری۔ ہم نے جب سنا کہ یہ مجلّہ حضرت علامہؒ کی ولادت سے ۱۹۰۸ء تک کے کوائف پر مشتمل ہے تو ہم حیران تھے کہ اس زمانے کے اقبالؒ سے متعلق کونسے ایسے حقائق و معارف ہوں گے جن کے لئے ساڑھے چار سو صفحات کی ضرورت لاحق ہو گئی ہو۔ اس لئے کہ ۱۹۰۸ء تک تو اقبالؒ ایک طالب علم یا مقامی شاعر کی حیثیت سے زیادہ متعارف ہی نہ تھے۔ مفکرِ اقبالؒ کی زندگی کا دور اس کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ کتاب سامنے آئی تو دیکھا کہ وہ ۱۹۰۸ء بھی نہیں، بلکہ ۱۹۰۵ء تک کے احوال و کوائف پر مشتمل ہے اور کثرتِ معلومات کا یہ عالم ہے کہ

گلچین بہارِ تو ز دامان گلہ دارد

اصل یہ ہے کہ نیازی صاحب نے اردو زبان میں سوانح نگاری کی ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ اس میں (مثلاً) اگر آغازِ سخن اس سے ہوتا ہے کہ اقبالؒ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے، تو سیالکوٹ کی پوری تاریخ سامنے لائی گئی ہے۔ اور اگر ذکر کیا ہے کہ وہ نور محمدؒ (عرف نتھو پارچہ دوز) کے ہاں پیدا ہوئے تھے تو ان کے والدِ ماجد

نور محمدؒ کا سلسلۂ نسب، اور ان کے اسلاف جس خطۂ کشمیر سے آئے تھے اس کا جغرافیہ، چشمۂ ویری ناگ اور دریائے جہلم کی طرح رواں دواں آنکھوں کے سامنے چلا آئے گا۔ اقبالؒ کا بچپن جس ماحول میں گذرا۔ اس کی طالب علمی جن فضاؤں میں پروان چڑھی۔ وہ بچے جوان کے ساتھ کھیلے۔ وہ لڑکے جوان کے ساتھ پڑھے۔ لاہور آئے تو وہ حلقۂ یاراں جس کے مشاغل کی داستانیں (بعض حقیقی، بعض افسانوی) زبان زدِ عوام و خواص ہیں۔ ان میں سے ایک ایک کا تفصیلی تعارف اور ان مجالس و محافل کی چلتی ہوئی تصویریں۔ کتاب کیا ہے، اُس دور کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ نیازی صاحب نے اس سے پہلے علامہ اقبالؒ کے متعلق جو کچھ لکھا (اور اس کے علاوہ انہوں نے لکھا ہی بہت کم ہے) اس کا تعلق ان کے فلسفہ اور نظریات سے تھا۔ اس لئے اس کی زبان بھی بڑی ادق اور مغلق ہوتی تھی۔ لیکن اس کتاب کی نوعیت چونکہ مختلف تھی اس لئے اس کی زبان بھی نسبتاً ہلکی پھلکی اور شگفتہ ہے اور مناظر کشی ایسی کہ قاری اسے ناول کی سی محویت کے ساتھ پڑھتا چلا جائے۔

نیازی صاحب نے لکھا ہے کہ اگر حضرت علامہ کی سوانح حیات اسی اسلوب و انداز سے مرتب کئے جائیں تو وہ شاید آٹھ دس جلدوں پر پھیل جائیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہم بالتخصیص کسے یہ مشورہ دیں لیکن جو کوئی بھی اسے درخورِ اعتنا سمجھے ہم اس کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ ایسا انتظام کردیں کہ نیازی صاحب اس منصوبہ کو تکمیل تک پہنچا سکیں۔ ان کی عمر اب اسّی برس سے اوپر ہو چکی ہے۔ فطرت کی طرف سے انہیں جس قدر مہلت مل جائے اس میں ان سے یہ کام لے لینا چاہیئے کہ ؎

بعدِ من ناید چو من مردِ فقیر

خود اس کتاب کے مقدمہ نگار کے الفاظ ہیں:۔

> سید نذیر نیازی عصرِ حاضر کے ان جید علماء اور متخصصینِ اقبالؒ کے زمرے میں شامل ہیں جنہیں ایک طویل عرصہ کے لئے حضرت علامہؒ کا شرفِ حضوری و قرب حاصل رہا ہے اور ان سے بہتر فاضل شخصیت شاید اب اس دنیا میں موجود نہیں جو علامہؒ کے سوانح حیات اور شخصیت کا تجزیہ کر سکے۔

لیکن جو ادارہ بھی اس کا بیڑہ اٹھائے، وہ اس کا خاص طور پر خیال رکھے کہ کتاب کی ترتیب، ربط، کتابت اور طباعت کے سلسلہ میں اس کا اس طرح جھٹکا اور مثلہ نہ کیا جائے جیسا کہ زیرِ تبصرہ کتاب کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اغلاط تو ایک طرف، نہ کتاب کے شروع میں فہرستِ مشمولات ہے، نہ آخر میں انڈکس، حالانکہ یہ لاینفک تھے۔

———(۰)———

۲۔ اشرف التفاسیر

از مفتی احمد یار خان صاحب

اشرف التفاسیر کا تعارف: تفسیر کے ناشر حافظ محمد ابراہیم نعیمی نے ان الفاظ میں کرایا ہے:۔

حضرت علامہ مفتی احمد یار خان صاحب نعیمی اشرفی دامت برکاتہم کی یہ سعی جمیلہ ان نوجوانانِ امت کے

دلوں کی تڑپتی ہوئی تمناؤں اور کروٹ لیتی ہوئی امنگوں کے لئے ایک روشن راہ ہے، جو جذبۂ احساس سے آشنا اور دردِ ملّت سے واقف ہیں۔ حضرت علامہ نے اردو زبان میں ایسی نفیس وجلیل تفسیر لکھی جس میں ربطِ آیات، شانِ نزول، علمی فوائد، فقہی مسائل، غیر مذاہب کے اعتراضوں کے جواب، صوفیانہ تفسیر نہایت خوبی کے ساتھ ذکر فرمائے ہیں (صـ۲)

خود صاحبِ تفسیر اپنی تفسیر کی تعریف میں فرماتے ہیں :-

آج کل ہر بد مذہب نے ترجمۂ قرآن کو اپنے لئے آڑ بنایا ہے، جگہ جگہ مسجدوں میں قرآنی ترجمے کے درس کے بہانے مسلمانوں کو بہکایا جا رہا ہے، جاہل سے جاہل اردو خوان جسے استنجا کرنے کی تمیز نہیں مفسر بنا ہوا ہے، اس کے لئے عرصہ سے میرا ارادہ تھا کہ کوئی ایسی تفسیر لکھوں جو کہ عربی معتمد تفاسیر کا خلاصہ ہو اور جس میں موجودہ فرقوں کے نئے نئے اعتراضات کے جوابات دیئے جائیں، لیکن بہت وجوہ سے اس کا موقعہ نہ ملتا تھا کہ ربّ تعالیٰ نے مجھے شہر گجرات علاقہ پنجاب میں بھیجا۔

اس کے بعد اپنی تفسیر کی دس خصوصیات لکھی ہیں اور اس کا تاریخی نام "اشرف التفاسیر" رکھا ہے۔

تفسیر مذکورہ کی چند جھلکیاں

قرآن وحدیث کا فرق

"قرآن وحدیث دونوں ہی وحیِ الٰہی ہیں، دونوں کی اطاعت ضروری ہے فرق اتنا ہے کہ قرآنِ کریم کی عبارت خدا کی طرف سے ہے اور مضمون بھی گویا جس طرح جبریلِ امین نے آکر سُنایا اسی طرح بلا کسی فرق کے حضور علیہ السلام نے بیان فرما دیا، حدیث میں یہ ہے کہ مضمون رب کی طرف سے ہوتا ہے اور الفاظ حضور علیہ السلام کے اپنے ہوتے ہیں۔ اب اس مضمون کا رب کی طرف سے آنا یا بطور الہام ہوتا ہے یا فرشتہ ہی عرض کرتا ہے لیکن اس کی ادا حضور علیہ السلام کے اپنے الفاظ سے ہوتی ہے، اسی لئے اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری لیکن اس کی تلاوت نماز میں بجائے قرآن شریف کے نہیں ہوسکتی کیونکہ عمل مضمون پر ہوتا ہے اور تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے اور اسی وجہ سے قرآنِ پاک کے احکام حدیث سے منسوخ ہوسکتے ہیں۔" (صـ۸)

قرآن کے فوائد

اس عنوان کے ماتحت لکھتے ہیں :-

"اب ہم قرآنِ پاک کے وہ فوائد بیان کرتے ہیں جو احادیث سے ثابت ہیں :-

(۱) جو شخص آیۃ الکرسی، صبح وشام اور سوتے وقت پڑھ لیا کرے تو اس کا گھر انشاء اللہ آگ کے لگنے اور چوری ہونے سے محفوظ رہے گا۔

(۲) خیال رہے کہ الٓـمّ متشابہات میں سے ہے جس کے معنی ہم تو کیا حضرت جبرئیل بھی نہیں جانتے مگر اس کے پڑھنے پر ثواب ہے، معلوم ہوا کہ تلاوتِ قرآن کا ثواب اس کے سمجھنے پر موقوف نہیں بغیر سمجھے تلاوت پر بھی ثواب ہے۔ ولایتی[1] مرکب دوائیں، مریض کو شفا دیتی ہیں اُن کے اجزاء معلوم ہوں یا نہ ہوں، یوں ہی قرآنِ

---

[1] اسے کہتے ہیں قیاس مع الفارق۔ کیا ولایتی مرکب دوائیں، بنانے والوں نے، اُن پر لکھ رکھا ہوتا ہے کہ ان پر غور وفکر نہیں کرتے ؟ یہ دوائیں فلسفۂ وُ اور اُولی الالباب کے لئے ہیں ؟ یا قرآن کی آیات دواؤں کی طرح چاٹ کی جاتی ہیں ؟ (طلوع اسلام)

کریم شفا اور ثواب ہے معنی معلوم ہوں یا نہ ہوں، دیکھو! بھینس دودھ کے لئے، بیل کھیتی باڑی کے لئے، گھوڑے اونٹ سواری اور بوجھ اٹھانے کے لئے پالے جاتے ہیں، مگر طوطی مینا صرف اس لئے پالے جاتے ہیں کہ وہ ہماری سی بولی بولتے ہیں اگرچہ بغیر سمجھے سہی۔ مینا طوطی تمہاری بولی بولیں تو تمہیں پیاری، اگر تم جناب مصطفےٰ کی بولی بولو تو رب کو پیارے۔ اسی سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو کہتے ہیں کہ بغیر معنے سمجھے قرآن پڑھنا بے کار ہے اس کا کوئی ثواب نہیں۔" (ص۱۶)

بسم اللہ کے فوائد

تفسیر کبیر وغیرہ میں ہے کہ بسم اللہ میں انیس ۱۹ حروف ہیں، اور دوزخ پر عذاب کے فرشتے بھی انیس ۱۹ ہی ہیں۔ امید ہے کہ اس کے ایک ایک حرف کی برکت سے ایک ایک فرشتے کا عذاب دور ہو جائے۔ دوسری خوبی یہ بھی ہے، کہ دن رات میں چوبیس گھنٹے ہیں، جن میں سے پانچ گھنٹے، پانچ نمازوں نے گھیر لئے، اور انیس گھنٹوں کے لئے بسم اللہ کے انیس حروف عطا فرمائے گئے۔ جو بسم اللہ کا ورد کرتا رہے، انشاء اللہ اس کا ہر گھنٹہ عبادت میں شمار ہوگا اور ہر وقت کے گناہ معاف ہوں گے۔

بسم اللہ کے بے شمار فائدے ہیں جن میں سے ہم کچھ تھوڑے سے "تفسیر کبیر" اور "تفسیر عزیزی" وغیرہ سے نقل کرتے ہیں۔ پہلا، جو شخص اپنی بیوی کے پاس جاتے وقت بسم اللہ پڑھ لے تو اس میں شیطان شریک نہ ہوگا اور اگر اس صحبت سے حمل قائم ہو جائے تو اس حمل کا بچہ اپنی زندگی میں جس قدر سانس لے گا، اس قدر اس کے باپ کے اعمال میں نیکیاں لکھی جائیں گی" وغیرہ۔ (ص۳۰)

سورہ فاتحہ کی تفسیر

جو شخص مریض لادوا ہو وہ چینی کے سفید برتن میں آب زمزم و زعفران سے سورۂ فاتحہ لکھ کر، دھو کر اکتالیس روز تک پیتا رہے تو انشاء اللہ شفا ہوگی اگر آب زمزم نہ ملے تو عرق گلاب لے لے اگر یہ بھی نہ میسر ہو تو کنوئیں کا پانی ہی کافی ہے — بعض صوفیاء کے یہاں یہ عمل ہوتا ہے کہ اگر کسی شہر میں طاعون یا کوئی اور وبائی بیماری پھیلے تو ایک تاشا یا نقارہ پر دائرہ کی شکل میں سورۃ حمد اور بعد میں سورۃ فاتحہ کو لکھتے ہیں، اور بیچ میں بندرہ کا نقش بناتے ہیں پھر ایک دنبے کے سامنے یہ تاشا بجاتے ہیں اور تاشا بجاتے ہوئے اس دنبے کو گلی کوچے میں گشت کراتے ہیں، اس کے بعد اس دنبے کو کنارہ شہر پر ذبح کر کے اس کا خون دفن کر دیتے ہیں اور اس کا گوشت فقیروں پر خیرات کر دیتے ہیں تو بفضلہٖ تعالےٰ اس وبا سے امن ملتی ہے، بعض صحابہ کرام رضؓ نے سانپ کے کاٹے ہوئے پر سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کیا اسے آرام ہوا غرضیکہ اس کے بے شمار فائدے ہیں۔ (ص۳۵)

الحمد للہ کی تفسیر

چند وجہوں سے اس آیت کو سب سے پہلے رکھا گیا، ایک یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا ہوتے ہی چھینک آئی آپ نے فرمایا۔ الحمد للہ رب العلمین ..... معلوم ہوا کہ یہ وہ پہلا کلمہ ہے جو حضرت انسان کے منہ سے نکلا۔ رب تعالیٰ نے اپنے کلام کو بھی اسی سے شروع

صلہ ناشر نے اس تفسیر کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ سعی جمیلہ نوجوانانِ امت کے دلوں کی تڑپتی ہوئی تمناؤں اور کروٹ لیتی ہوئی امنگوں کے لئے ایک روشن راہ ہے"۔ ان دلائل نے نوجوانانِ امت کی راہوں کو کس قدر روشن کیا ہے اس کا فیصلہ وہ نوجوان ہی کر سکیں گے۔ سچ فرمایا تھا علامہ اقبالؒ نے کہ "دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم قرآن مجید ہے"۔ (طلوع اسلام)

فرمایا۔ دوسرے یہ کہ الحمد للہ میں آٹھ حروف ہیں اور جنت کے دروازے بھی آٹھ ہیں، تو جو شخص صفائی قلب سے اسے پڑھے گا وہ انشاء اللہ جنت کے آٹھوں دروازوں کا مستحق ہوگا۔ (صفحہ ۳۶)

مغضوب علیھم ولا الضآلین سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مغضوب علیھم وہ لوگ ہوں جن کی بدعقیدگی حد کفر تک پہنچ گئی ہو۔

ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی سُنتیں اسّی برس کی عمر میں ختنہ کا حکم ملا، اسی وقت گھر سے تیشہ لے کر خود اپنا ختنہ کر لیا۔ وحی آئی کہ اے ابراہیم! تم نے اس کام میں جلدی کی۔ عرض کیا۔ مولیٰ تیری اطاعت میں شتابی منظور تھی۔

ابراہیم علیہ السلام کے فضائل ایک دفعہ آپ کے زمانے میں قحط سالی ہوئی غلہ کہیں میسر نہ ہوتا تھا۔ آپ نے بوریوں میں سرخ ریت بھروا کر منگوالیا جب کھولا گیا تو شربتی گیہوں تھے، جب اسے بویا گیا تو اس کے درختوں میں جڑ سے اوپر تک بالیاں لگیں، ایک دفعہ کفار نے آپؑ پر دو شیر چھوڑے، شیر دل نے آپ کو سجدہ کیا اور آپ کے قدم پاک چاٹنا شروع کر دیئے۔ (صفحہ ۴۶۳)

(اس کے بعد کچھ ایسے اقتباسات ہیں جنہیں نقل کرنے سے شائع ہے۔ طلوع اسلام)

راقم الحروف نے قارئین کے لئے محض جلد اوّل (مشتمل بر پارۂ اوّل) کے چند ایک نوادرات، بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کئے ہیں۔ ان سے دیگر جلدوں میں مندرج عجائبات کا اندازہ فرمالیجئے۔ (ابو العامر)

نوٹ:۔ طلوع اسلام نے خود اس تفسیر کو نہیں دیکھا۔ لیکن ابو العامر صاحب قابلِ اعتماد تبصرہ نگار ہیں اس لئے ہم نے ان کے پیش کردہ اقتباسات درج کر دیئے ہیں۔ طلوعِ اسلام

فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۹۷۔ ایم رمضان صاحب (ہیکنی لندن) بذریعہ روشن عباسی صاحب معرفت بزم طلوع اسلام انگلینڈ	۱۱۶-۹۰	۳۶۵۷
۹۸۔ مشتاق احمد صاحب (ریجنٹس پارک) " " " " " " "	۱۱۶-۹۰	۳۶۵۸
۹۹۔ علی محمد صاحب (" ") " " " " " "	۱۱۶-۹۰	۳۶۵۹
۱۰۰۔ اے رزاق صاحب (لندن) " " " " " " "	۱۱۶-۹۰	۳۶۶۰
۱۰۱۔ کوثر فاروق صاحب (ہیکنی لندن) " " " " " "	۱۱۶-۹۰	۳۶۶۱
۱۰۲۔ حبیب احمد عاصم صاحب (لندن) معرفت بزم طلوع اسلام۔ لندن	۴۳۳۸-۸۹	۳۶۶۲
۱۰۳۔ علی اختر صاحب (والتھم سٹو) " " " " " "	۳۵۰/۴۰	۳۶۶۳

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۱۰۴۔ منظور محمد فرحت صاحب (لندن) معرفت طلوع اسلام۔ لندن	۲۳۳/۸۰	۳۶۶۴
۱۰۵۔ جی عباس صاحب (ویمبلے) " " " " " "	۱۱۶/۹۰	۳۶۶۵
۱۰۶۔ مسعود الرحمٰن صاحب (مالہم) " " " " " "	۱۲۷/۴۰	۳۶۶۶
۱۰۷۔ سلیم اختر صاحب (والتھم سٹو) " " " " " "	۳۵۰/۴۰	۳۶۶۷

میزان	۴۷۳۵-۱۲
سابقہ میزان	۵،۵۸،۸۷۵-۵۳
کل میزان	۵،۹۲،۹۰-۶۵

قرآنِ مجید

اور (۱۹) کے عدد کا چکر

کچھ عرصہ ہوا بعض احباب نے ہمیں لکھا کہ کوئی صاحب امریکہ میں بیٹھے نہایت سادگی و پرکاری سے قرآنِ مجید کے خلاف ایک سازش پھیلا رہے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے حروف کی تعداد (۱۹) ہے۔ قرآنِ مجید کی مختلف آیات اور ... الفاظ کو یوں جمع اور یوں تقسیم کیا جائے تو اس کا حاصل (۱۹) آتا ہے۔ یہ ریاضیاتی فارمولا قرآنِ مجید کا معجزہ ہے۔ اور اس کے عام کرنے کی اشد ضرورت۔ ہم نے اس وقت اس جاہلانہ مغالطہ آفرینی کو چنداں درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور مستفسرین کو انفرادی طور پر لکھ دیا کہ قرآنِ مجید انسانی راہ نمائی عطا کرتا ہے اور یہی اس کا معجزہ ہے۔ اسی اعتبار سے وہ بے مثل و بے نظیر ہے۔ اس قسم کی ریاضی شعبدہ بازی کو اگر کسی کتاب کے الہامی (یعنی وحی) ہونے کا ثبوت تسلیم کر لیا جائے تو معلوم کتنی انسانی تصانیف اس زمرہ میں شامل ہو جائیں۔ لہٰذا، ہمیں اس فریب دہی سے محتاط رہنا چاہیئے۔

اس کے بعد اس سلسلہ میں ہمیں یکے بعد دیگرے لٹریچر موصول ہونا شروع ہو گیا جس سے ہم نے اندازہ لگایا کہ یہ پراپیگنڈہ کی کوئی خاص مہم ہے اور قرآنِ مجید کے خلاف گہری سازش۔ اس لئے اسے بے نقاب کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس باب میں تفصیلی طور پر لکھنے کا سوچ رہے تھے کہ حسنِ اتفاق سے ہمارے سامنے، ماہ نامہ فکر و نظر کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۸۰ء میں محترم عبدالقدوس ہاشمی صاحب کا ایک مختصر لیکن جامع مقالہ آیا جو اس موضوع پر اچھی روشنی ڈالتا ہے۔ اسے ہم (ہاشمی صاحب اور ماہ نامہ مذکور کے شکریہ کے ساتھ) درجِ ذیل کرتے ہیں۔ سردست ہم اس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اگر ضروری ہوا تو اس کی مزید وضاحت بھی کر دی جائے گی۔ ہاشمی صاحب نے پہلے سیکرٹری ادارۂ تحقیقات اسلامیہ کے نام ایک خط لکھا ہے اور اس کے بعد اپنا مقالہ۔ اس خط میں وہ تحریر فرماتے ہیں:-

> قرآنِ مجید اپنی فصاحت و بلاغت، ہدایات و رہنمائی کی وجہ سے معجزہ ہے۔ کسی ریاضیاتی نظم یا بنیاد کی بنا پر معجزہ نہیں ہے۔ کافروں کو جب قرآنِ مجید نے چیلنج کیا تو اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ایسی ہی ریاضیاتی بنیاد پر ایک یا دس سورہ بنا لاؤ۔ اور نہ یہ بات قابلِ قبول ہے کہ قرآن کا یہ کمال نہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا اور نہ صحابہ کرامؓ کو۔

یہ (۱۹) کا عدد قدیم لوبالا میں مقدس تھا کہ اس میں عدد اوّل یعنی (۱) اور سب سے بڑی اکائی (۹) شامل ہے۔ اس کو مدعی نبوت بابک خرمی مقتول ۲۲۳ھ اور اس کے ساتھیوں نے پھیلایا۔ پھر پچھلی صدی میں بہاء اللہ مرزا حسین علی نوری نے اسے تقدس عطا کیا۔ اب بہائیوں نے اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں یہ بات امریکہ سے پھیلائی ہے۔

لوگ عجائب پسند ہوتے ہیں۔ یہودی (۷) و (۱۲) کو مقدس کہتے ہیں، عیسائی (۱۳) کو منحوس سمجھتے ہیں اور خود مسلمانوں میں پورا نظام اعداد منحوسہ متحابہ اعداد متباغضہ کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ قمر در عقرب، پنچک، رجال الغیب، سفر چہار شنبہ منحوس، اور نہ جانے اور کتنے ہی اوہام پیدا ہو چکے ہیں۔ اب اس نئی مہم کی اشاعت سے ایک مزید واہمہ پیدا کرنے کے سوا اور کیا فائدہ ہوگا۔

دعا ہے کہ اللہ ہم کو اور آپ کو بھی اوہام سے بچائے۔

اس کے بعد ان کا مقالہ سامنے آتا ہے جس کا عنوان ہے۔ "قرآنِ مجید اور عدد ۱۹"۔ وہ درج ذیل ہے:۔

"کوئی سال ڈیڑھ سال سے کئی کتابچے اور اشتہارات مجھے اس مضمون کے بھیجے گئے ہیں کہ قرآنِ مجید میں (۱۹) کے عدد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور کمپیوٹر کے ذریعہ مختلف حروف کی تعداد کو جمع اور ضرب کے عمل سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ سب (۱۹) کے گرد گھومتے ہیں اور یہی قرآنِ مجید کی ریاضیاتی بنیاد ہے۔ یہ ریاضیاتی بنیاد قرآنِ مجید کا معجزہ ہے اور کتاب اللہ کے الہامی ہونے کی دلیل ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ امریکہ میں کمپیوٹر کے ذریعہ اس کی تحقیق کی گئی ہے اور وہیں سے اسے پھیلایا جا رہا ہے۔ قرآنِ مجید کا یہ معجزہ پچھلے چند سال کے اندر ظاہر ہوا ہے جو پہلے کسی کو معلوم نہ تھا۔"

اس تحقیق کی بنیاد اس پر ہے کہ اللہ تعالےٰ نے قرآنِ مجید کی سورہ المدثر کی آیت (۳۰)۔ (۷۴/۳۰) میں جہنم پر متعین فرشتوں کی تعداد (۱۹) بتائی ہے۔ اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں حروف کی تعداد (۱۹) ہے۔ اس کے بعد مختلف حروف کی تعداد کو (۱۹) یا (۱۹) کا حاصل ضرب ثابت کر کے یہ تأثر پیدا کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کا ایک ریاضیاتی نظام ہے اور وہ نظام (۱۹) کے عدد پر قائم ہے۔

اس سلسلہ میں جتنے اشتہارات اور کتابچے ملے میں نے انہیں بہت غور کے ساتھ بار بار پڑھا۔ سب سے پہلے دو سوالات ذہن میں آئے۔ اوّل یہ کہ قرآنِ مجید میں تو اور بہت سے اعداد مختلف آیات میں مذکور ہیں۔ ۱-۲-۳-۴-۵-۶-۷-۸-۹-۱۰-۱۱-۱۲- اور اسی طرح ۱۹ - ۲۰ - ۳۰ - ۴۰ - سو، ہزار سب ہی مذکور ہیں۔ فرشتوں کی تعداد بھی سورۃ الحاقہ، آیت (۱۷) (۶۹/۱۷) میں حاملانِ عرش کی آٹھ بتائی گئی ہے۔ پھر صرف (۱۹) کے عدد ہی کو کیوں ریاضیاتی بنیاد بتایا جا رہا ہے۔ کیا اس عدد سے کسی کی عقیدت وابستہ ہے؟ دوم یہ کہ جن لوگوں نے امریکہ سے یہ آواز اٹھائی ہے وہ کون لوگ ہیں؟

اس سے قبل کہ اس نظریہ کی عقلی و علمی تحلیل کی جائے، ان دونوں سوالوں کا حل کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

۱- دنیا کے مختلف علم الاصنام (میتھالوجی) میں اعداد کے اثرات کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بلکہ اس زمانہ میں بھی چیرو وغیرہ کی تصنیفات علم الاعداد کے اثرات کو ظاہر کرتی ہیں۔ اسکندریہ اور شام سے جب ماقبل الاسلام کے بت پرستانہ اوھام مسلمانوں میں پہنچے تو یہ افکار مسلمانوں میں آگئے۔ یہاں تک کہ (۷۸۶) کا عدد بجائے بسم اللہ استعمال ہونے لگا۔ اور آہستہ آہستہ یہ واہمہ اتنی ترقی کر گیا کہ قرآنِ مجید کی ہر سورہ اور ہر آیت کے اعدادِ جمل تیار ہوئے اور ان سے تعویذوں کا کام اب بھی لیا جاتا ہے۔ (۱۹) کا عدد سب سے بڑی اکائی (۹) اور اوّلین عدد (۱) کا مرکب ہے۔ اس سے بڑی بڑی کرامات لوگوں نے وابستہ کی ہیں۔ اگرچہ مسلمانوں نے ان اوھام کو کبھی قبول نہیں کیا مگر جاہل عوام چالاک پیشواؤں کے پھندوں میں کچھ نہ کچھ پھنستے رہے اور آج بھی بہت سے لوگ پھنسے ہوئے ہیں۔

۲- اس وقت جو (۱۹) کی اہمیت قرآنِ مجید میں ثابت کی جا رہی ہے وہ بہائیوں کی تبلیغی مساعی کی پیداوار ہے۔ کئی ہزار بہائی امریکہ میں رہتے ہیں۔ ان کے عقیدہ میں (۱۹) کا عدد پوری کائنات کا بنیادی عدد ہے۔ اس پر سارا جہان قائم ہے انہوں نے حسابی مغالطہ دے کر مسلمانوں کو متاثر کرنے کی ایک جدوجہد کے طور پر اسے شروع کیا ہے اور ہر زبان میں اس کی اشاعت ہو رہی ہے۔

عدد (۱۹) کی برتری کا عقیدہ انہوں نے اس طرح قائم کیا ہے کہ بابی مذہب کا بانی علی محمد باب ۱۸۱۹ء میں شیراز کے شیعہ گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اور ۱۸۵۰ء میں اُسے بجرمِ بغاوت پھانسی دی گئی۔ اس کے ماننے والے تین فرقوں میں بٹ گئے، بابی اصلی[ط] بہاء اللہ مرزا حسین علی نوری کے پیرو بہائی، اور اس کے بڑے بھائی یحییٰ نوری نورِ ازل کے پیرو ازلی، علی محمد باب نے قرآنِ مجید کے مقابلہ میں ایک کتاب "البیان" بھی لکھی ہے اور بہاء اللہ نے بھی ایک کتاب "الاقدس" تیار کی ہے جسے بہائی قرآنِ مجید کے برابر الہامی مانتے ہیں۔ ان کے عقیدہ میں علی محمد باب ظہورِ الٰہی تھا۔ اس کا سالِ پیدائش ۱۸۱۹ء ہے اور اس کو جمع کیجیے تو (۱۹) کا عدد حاصل ہوتا ہے۔ (۹ + ۱ + ۸ + ۱ = ۱۹) اس عقیدہ کے بعد ساری کائنات کی ریاضیاتی بنیاد (۱۹) کو قرار دیا گیا۔ بہائیوں کی مذہبی تقویم میں ۱۹ - ۱۹ دن کے ۱۹ مہینے ہوتے ہیں۔ ۱۹ × ۱۹ = ۳۶۱۔ شمسی سال کے باقی چار دن کو سال کے ایامِ متفرقہ قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح ۳۶۵ دن پورے کر لئے گئے۔ ازلی فرقہ تو یحییٰ نورِ ازل کے جلد ہی وفات پا جانے کے بعد کچھ پھل پھول نہ سکا لیکن بہائی خوب پھلے پھولے۔ بہاء اللہ اور اس کے بعد عبد البہاء عباس آفندی اور اس کے بعد شوقی ایک دوسرے کے بعد مہدی اور مُلہم ہوتے رہے۔ دولتِ اسرائیل ان کی سرپرست ہے اور فلسطین میں مقام عکہ ان کا صدر مقام ہے۔ یہ لوگ جگہ جگہ اپنا تبلیغی مرکز "بہائی ہال" بناتے اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ مگر خفیہ طور پر اپنا کام کرتے ہیں۔ آگرہ میں اور دہلی میں ان کے مراکز ہیں۔ کراچی میں برنس ریکارڈ روڈ پہ

ط یہاں کچھ سہوِ کتابت معلوم ہوتا ہے۔ شاید اصل عبارت یوں ہو "علی محمد باب کے پیرو بابی۔ اس کے جانشین بہاء اللہ مرزا حسین علی نوری کے پیرو بہائی۔ اور یحییٰ نوری کے پیرو ازلی۔" (طلوعِ اسلام)

ان کا بہائی مال ہے۔ ہر جگہ دیواروں پر (۱۹) کا عدد لکھا ہوتا ہے۔ ہر تحریر کو (۱۹) سے شروع کرتے ہیں۔ اور ہر شہ نشین پر (۱۹) کا عدد نمایاں طور پر لکھا جاتا ہے۔

اد پر کی تحریر و تحلیل سے ہم ان دو سوالوں کے جواب تو پا لیتے ہیں کہ عدد (۱۹) کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے اور کون لوگ اس مہم کو چلا رہے ہیں۔ رہا اس پورے نظریہ کا عملی جائزہ تو اس کے لئے کسی طویل تحریر کی ضرورت نہیں۔ ذرا غور کیجئے تو اس نظریہ میں پنہاں جہالت اور مغالطہ کھل کر سامنے آجائے گا۔

۱۔ اگر کسی کتاب میں کوئی عدد، حرف یا اعراب یکساں ٹوٹے تو کیا ایسا ہونا کتاب کو الہامی ثابت کرتا ہے؟ اگر چاول کا رنگ سفید ہے تو کبھی یہ بات زمین کے کروی ہونے کی دلیل ہو سکتی ہے؟ یہ معیار کس نے قائم کیا اور دعویٰ و دلیل کے مابین منطقی تعلق کیا ہے؟

۲۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے حروف خاص طرزِ کتابت کی وجہ سے (۱۹) نظر آتے ہیں۔ ورنہ اصلاً (۲۱) ہیں۔ باسم اللہ الرحمان الرحیم۔ اس میں اسم کا الف نہیں لکھا جاتا اور رحمٰن اصل میں فعلان کے وزن پر سعدان، عفران، حیران وغیرہ کی طرح رحمان ہے۔ بخود قرآنِ مجید کی پہلی وحی میں "اقرا باسم ربک" موجود ہے "سبح باسم ربک" موجود ہے۔ سب جگہ الف لکھا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید آسمان سے تحریری شکل میں نازل نہیں ہوا تھا اس لئے اس کے رسم الخط سے کوئی استدلال صحیح نہیں ہو سکتا۔

۳۔ سورۃ الاعراف میں بسطۃ بر ص آوانہ میں عدنانی قبائل کے فرق کو ظاہر کرنے کے لئے بنا دیا جاتا ہے۔ ورنہ عربی زبان میں بصسط کوئی مادہ ہی نہیں۔ یہ استدلال محض نادانی اور جہالت کا کرشمہ ہے۔

۴۔ اس طرح جمع، تفریق اور ضرب و تقسیم کر کے بیسیوں عددی عجائبات قرآنِ مجید میں بلکہ معمولی انسانی تصانیف میں پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً حٰم کے اعداد جمل (۴۸) کو سورۃ الحاقہ میں بیان کئے ہوئے عدد یعنی (۸) پر تقسیم کیا جائے تو (۶) کا عدد برآمد ہوگا۔ اور الٓمّٓ (۶) سورتوں کے اوائل میں ہے۔ قرآنِ مجید میں (۲۹) سورتوں پر (۱۴) حروفِ تہجی بطور حروفِ مقطعات موجود ہیں اور یہ ۱۴ گروپ ہیں۔ ۱۴ × ۱۴ = (۱۹۶) اور اس عدد کو اصحابِ کہف کے عدد (۷) پر تقسیم کیجئے تو چاند کے (۲۸) لمعات کا عدد ہو جائے گا۔ اس طرح جتنے عجائبات عددی چاہیں کسی کتاب سے نکال سکتے ہیں۔ کتنی دلچسپ ابلہ فریبی ہے کہ اس قسم کے حسابی اور عددی عجائبات کو قرآنِ مجید کے معجزہ یا وحی آسمانی ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیا جائے۔ انسان طبعاً عجوبہ پسند ہوتا ہے اس لئے اچھے خاصے ذی ہوش اور تعلیم یافتہ لوگ بھی ایسی باتوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور ابلہ فریبی کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ خدا ہم سب کو وہم سے بچائے اور بہائیوں کے اس چکر سے محفوظ رکھے۔"

―――(۰)―――

ھ عربی زبان کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ فیضی نے عربی زبان میں قرآنِ مجید کی ایک ایسی ضخیم تفسیر لکھی ہے جس میں ایک حرف بھی ایسا نہیں آیا جس پر نقطہ ہو کیا اسے بھی "الہامی" سمجھا جائے گا۔

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے!

قرآنِ مجید کی حکمرانی

طلوعِ اسلام نے جب، تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد (۱۹۴۸ء میں) یہ آوازِ بلند کی کہ اس خطۂ زمین کو اس لئے حاصل کیا گیا ہے کہ اس میں قرآنِ کریم کی حکمرانی ہو، اور یہ کتابِ عظیم، زندگی کے ہر گوشے میں راہ نمائی کے لئے کافی بھی ہے اور خود مکتفی بھی، تو اس کی تائید میں تو (یوں کہیئے کہ) ایک ہاتھ بھی نہ اُٹھا۔ لیکن اس کی مخالفت میں طوفان برپا کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر اور احسان ہے کہ اس نے اس ہجومِ مخالفت کا ذرہ برابر بھی اثر نہ لیا، (اگرچہ بعض اوقات یہ بڑی شدت اختیار کر جاتی تھی) اور وہ کامل ثبات و استقامت سے اس آواز کو بلند کئے چلا گیا ــــ یکہ و تنہا۔ بے ساز و یراق ــــ اس استقامت و استقلال کا نتیجہ تھا کہ اس آواز نے فضا کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ مختلف گوشوں سے اس کی تائید میں ہاتھ اٹھنے شروع ہو گئے۔ ایک طرف وابستگانِ فکرِ قرآن کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ دوسری طرف مخالفین بھی اپنے مواعظ، خطبات، خطابات، تقاریر میں قرآن کے حوالے دینے پر مجبور ہو گئے۔ یہاں تک کہ اب ان کے ہاں قرآنی آیات کا مفہوم بھی وہی بیان ہوتا ہے جو طلوعِ اسلام پیش کرتا چلا آ رہا ہے۔ اصطلاحات بھی وہی استعمال ہوتی ہیں۔ نکات بھی وہی نمایاں کئے جاتے ہیں، اس احتیاط کے ساتھ کہ اوّل و آخر طلوعِ اسلام کے خلاف بھی کچھ نہ کچھ ضرور کہہ دیا جاتا ہے۔ ہمیں اس سے خوشی ہوتی ہے کہ قرآن کی آواز عام ہو رہی ہے۔ اور ہمارے خلاف جو کچھ کہا جاتا ہے۔ اس کا قطعاً ملال نہیں ہوتا کہ، غرض اندر میاں! سلامتِ اوست۔

اس سلسلہ میں اب اخبارات اور جرائد میں ایسے مقالات بھی شائع ہو رہے ہیں جو طلوعِ اسلام سے یکسر ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہمیں محترم حکیم محمد سعید صاحب کے اس مقالہ میں ملتی ہے جو کراچی کے روزنامہ جنگ کی ۱۳ اگست ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں، یومِ استقلال کی تقریب پر شائع ہوا ہے۔ اسے محترم حکیم صاحب اور روزنامہ جنگ کے شکریہ کے ساتھ ہدیۂ قارئین کیا جاتا ہے۔

(۰)

آزادی اور قرآنِ مجید

اس کرۂ ارض پر مختلف اور متعدد اقوام و ملل آباد ہیں۔ کب سے آباد ہیں یہ کوئی صحیح نہیں جانتا۔ کتنے

آباد و قائم رہیں گی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فیصلۂ غیب کیا ہے۔ ان اقوام و ملل کی بہرحال ایک تاریخ ہے — یہ انسانی تاریخ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب اگر یہ دیا جائے تو بجا ہوگا اور درست کہ اقوام و ملل نے اپنے ہر دور میں اور پورے تسلسل کے ساتھ اپنی آزادی اور اپنی حریتِ فکر کے لئے جو جدّ و جہد کی ہے۔ ہر انسانی تاریخ اس کی ایک داستانِ مسلسل ہے۔ انسانی تاریخ کے آپ کسی بھی دور میں چلے جائیے۔ یہ دور غاروں کا دور ہو یا جھونپڑوں یا محلات کا۔ کاغذ کا دور ہو یا دھاتوں کا دور ہو یا پتھروں کا دور ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر دور میں انسانی تمدّن کے انداز بدلے ہیں۔ ثقافت کے نقشے نئے نئے قائم ہوئے ہیں۔ افکار و حوادث کے لئے نئے رنگ قائم ہوئے ہیں۔ خیالات میں انقلابات آئے ہیں۔ اس کے باوجود تاریخِ انسانی کے ہر دور میں ایک قدرِ مشترک ہر قوم و ملّت میں رہی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تضادات و تباین کے باوجود اور اختلاف و تنوع کے باوصف انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ اور ہر حال میں اور ہمہ وقت آزادی کی حمد و ستائش کی ہے اور اپنی آزادی کو قائم اور باقی رکھنے کی جہدِ مسلسل اور سعیٔ کامل کی ہے۔ اس جہدِ مسلسل اور سعیٔ کامل کا نام تاریخِ انسانی ہے۔

ہندوستان میں جب تحریک آزادی نے جنم لیا اور برطانوی استعمار کے خلاف اہلِ وطن جب صف آراء ہوئے تو اس وقت تحریکِ آزادی کا مفہوم و منتہا اور مقصود یہ تھا کہ برطانوی استعمار اور انگریز کی طاقت کو پاش پاش کر دیا جائے اور اس کی جگہ اپنی حکومت قائم کی جائے۔ اس تحریک میں برصغیر کی تمام قومیں (امتیاز کے بغیر) شریک تھیں۔ اس موقع پر شاعرِ مشرق، حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی رہنمائی قرآن کی روشنی میں کی۔ علامہ اقبالؒ نے مغرب کے جمہوری نظام کو اسلام کے خلاف سازش قرار دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ مغرب کا جمہوری نظام استبدادِ ملوکیت کی ایک نقاب پوش شکل ہے۔ اس میں نوعِ انسانی کبھی آزادی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ یہ مغربی اندازِ فکر نظام جمہوریتِ اسلام کی ضد ہے۔ اس لئے اس میں مسلمان کو وہ آزادی میسّر نہیں آ سکتی کہ جو اسے اسلام عطا کرتا ہے۔ اس مغربی نظامِ جمہوریت نے اور اشتراکیت نے یہ آواز بلند کیا کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ انہی کو حقِ حکومت پہنچتا ہے۔ مگر قرآنِ کریم اس مفروضے کو باطل قرار دیتا ہے۔ قرآنِ کریم کے نزدیک کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنائے۔ اس صورتِ حال میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکومت اگر کسی انسان کو حاصل نہیں ہے تو پھر یہ حق کسے حاصل ہے؟ قرآن انسانوں کی تمدّنی زندگی کے لئے نظامِ حکومت ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ حکومت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (الانعام، ۵۷)

وہ اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (الکہف: ۲۶)

اس اساس پر اور اس بنا پر

امر الا تعبدوا الا ایاہ (یوسف: ۴۰)

اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔

ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ۔ (یوسف: ۴۰)

یہی محکم نظام حیات ہے، لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے اور وہ انسانی حکومتوں کی ہیئت بدل کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے غلامی کی زنجیریں کاٹ دی ہیں اور آزادی کا سانس لے لیا ہے۔

قرآن واضح الفاظ میں اور ذرہ برابر ابہام کے بغیر کہتا ہے کہ

حکومت اللہ کی کتاب یعنی قرآن حکیم کے ذریعہ قائم ہو گی جس میں کسی انسان کو دخل نہ ہو گا کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتا۔

اس حقیقت کی توضیح و تشریح کے لئے خود زبان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا۔

ترجمہ:- "کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میں اللہ کے سوا کسی اور حاکم کی طلب وجستجو کروں، حالانکہ اس نے اپنی کتاب نازل کر دی ہے کہ جو مفصّل ہے"۔

برصغیر کے مسلمان تحریک آزادی میں شریک ہوئے اور اس جدوجہد آزادی میں اس نظریہ اساس کے ساتھ مستعد و متحرک ہوئے کہ وہ پاکستان قائم کریں گے جہاں قرآن کی حکومت ہو گی اور اللہ کا قانون نافذ ہو گا۔ ان کے پاس جذبہ صادق تھا۔ یہ ان کا ایمان کامل تھا اور ان کا یقین محکم کہ دنیا کی ہر بڑی طاقت مسلمانان برصغیر کے جوش ایمانی کے سامنے زیر ہو گئی اور غیر ملکی استعمار نے ہار مان لی۔

یہ عجیب اور حیرت انگیز حقیقت ہے اور کرشمۂ الٰہی کہ پاکستان ٹھیک اس دن عالم وجود میں آیا اور منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا کہ ۲۷ رمضان المبارک تھی یوم نزول قرآن تھا! بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ پاکستان ایسے دن قائم ہوا کہ جو تمام عالم اسلام کے نزدیک مبارک و متبرک ہے۔ اور جس کی عظمت و تقدیس میں پورا عالم اسلام متفق ہے۔ درحقیقت اللہ کا یہ بڑا اہم فیصلہ تھا کہ پاکستان قائم ہو اور اس میں حکومت قرآن قائم ہو۔

۲۷ رمضان یوم نزول قرآن ہے۔ اس یوم مبارک کے بارے میں قول فیصل ہے اور حرف آخر کہ اسلام اور عالم اسلام کے لئے یہ تاریخ ساز دن ہے، اس دن قرآن کریم نازل ہوا اور اس لئے نازل ہوا کہ اس کرۂ ارض کی ہر تاریکی کو روشنی سے منور کر دے اور ہر باطل کو مٹا کر حق کو قائم کر دے، اور اس کرۂ ارض پر اللہ کے قانون کی حکمرانی ہو۔

اس باب میں قرآن کے احکامات واضح ہیں اور بیّن: سورۂ مائدہ میں ارشاد ربانی ہے:-

وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿المائدہ ۴۴﴾

یعنی "جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی کافر ہیں"۔

اور اس کے ساتھ ہی رسول اللہ ؐ سے فرمایا گیا:-

وَ اَنِ احۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ۔ (المائدہ: ۴۹) "ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو"۔

قرآن کریم میں اللہ کے سوا ہر طاقت کو طاغوت کہا گیا ہے اور کفر اور ایمان کے اس فرق کو ان الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے :-

فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا - (البقرۃ : ۲۵۶)

یعنی "جو اللہ پر ایمان لایا اور اُس نے طاغوت سے کفر برتا تو اس نے ایسا محکم سر رشتہ تھام لیا جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا"

اس ارشادِ باری تعالٰی کی روشنی میں ہمیں یہ غور کرنا چاہیئے کہ وہ لوگ کہ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ پر ایمان لائے ہیں لیکن عملاً ان کا حال یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ

أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ - (النساء : ۶۰)

اپنے مسائل و معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں - حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ طاغوت سے کفر برتیں - ایسے لوگ صحیح راہ پر نہیں ہیں ۔ وہ ایک سانس میں اللہ کے قانون کی بات کرتے ہیں ، مگر دوسرے میں اس کی نفی کرتے ہیں - ان کا قلب و ایمان متزلزل ہے -

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهِ - (الانعام : ۱۱۵)

اللہ کے کلمات (قوانینِ الٰہی) صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے - یہ قوانین غیر متبدل ہیں -

۲۷ رمضان المبارک کو پاکستان قائم ہوا تھا ، عالم وجود میں آیا تھا - اس کی حیثیت تاریکی میں نور کی ہے - ہم نے اللہ سبحانہ، وتعالٰے سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم پاکستان کو اسلامی مملکت بنائیں گے - ہمیں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے کہ کیا ہم نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے ؟ اگر نہیں تو جاگیئے اور بیدار ہو جائیے - آج یومِ استقلال پاکستان ہے ہم کو ایک تاریخ ساز فیصلہ کرنا ہے کہ

پاکستان میں اقتدارِ اعلیٰ قرآنِ مجید و فرقانِ حمید کو حاصل ہو گا -

مملکتِ پاکستان کا فریضہ قرآنی احکام و قوانین کو عملاً نافذ کرنا ہو گا -

پاکستان کا ہر فرد قرآن کے مطابق زندگیوں کو ڈھالے گا اور پیروی اور اتباعِ سنتِ رسول کرے گا -

اور ایک ایسا قرآنی نظامِ شوریٰ قائم کیا جائے گا جو بازی گری ، سیاست اور مذہبی فرقہ بندیوں سے ماورا ہو گا -

(۰)

ضرورت رشتہ

امورِ خانہ داری اپنے ہاتھوں سرانجام دینے والی ایف اے پاس چوبیس سالہ دوشیزہ کے لیے موزوں رشتہ درکار ہے -

خط و کتابت (بصیغۂ راز) [م - ر - خ]

معرفت - ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور

اِسلامی نظامِ حکومت کے خط و خال

(چند استفسارات کے جواب)

روزنامہ مشرق کی ۲۱ جولائی کی اشاعت میں، عبدالکریم عابد صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں، انہوں نے (منجملہ دیگر امور) کہا کہ

(۱) پرویز صاحب کا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام میں سیاسی جماعتوں اور مذہبی فرقوں کا وجود ممنوع ہے۔ اور

(۲) وہ کہتے ہیں کہ اولی الامر کو حکومت کے غیر محدود اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

طلوعِ اسلام نے اپنی ستمبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت کے لمعات میں لکھا کہ (۱) یہ صحیح ہے کہ پرویز صاحب سیاسی جماعتوں اور مذہبی فرقوں کو خلافِ اسلام سمجھتے ہیں۔ لیکن (۲) یہ ان پر کھلا ہوا بہتان ہے کہ وہ اولی الامر کو غیر محدود اختیارات کا حامل قرار دیتے ہیں۔ "غیر محدود اختیارات" تو ایک طرف ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام کی رُو سے، کسی انسان کو سرے سے حقِ حکومت ہی حاصل نہیں۔ وہ قریب چالیس سال سے قرآنِ کریم کی روشنی میں اسلامی مملکت کا تصوّر پیش کرتے چلے آرہے ہیں، جس کا اصل الاصول یہ ہے کہ کسی انسان (یا انسانوں کے گروہ کو خواہ اس کا نام کچھ بھی کیوں نہ رکھ لیا جائے) دوسرے انسانوں پر حقِ حکومت حاصل نہیں (طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۷۹ء میں پرویز صاحب کا تفصیلی خطاب شائع ہوا تھا، جس کا حسنِ اتفاق سے، عنوان ہی یہی تھا)۔

ہم نے اپنے اس شمارہ کی ایک کاپی روزنامہ مشرق کو بایں استدعا بھیجی تھی کہ وہ ہمارے اس جواب کو اپنے ہاں شائع فرما دیں یا کم از کم اسے عابد صاحب کی خدمت میں بھیج دیں۔ ہمارا وہ جواب تو مشرق میں شائع نہیں ہوا لیکن اس کی ۱۹ ستمبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں عابد صاحب کا ایک اور مقالہ شائع ہوا جس میں انہوں نے کچھ سوالات پوچھ کر کہا کہ مدیر طلوعِ اسلام، مشرق میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کریں۔ چنانچہ ذیل کا جواب روزنامہ مشرق کو بغرضِ اشاعت بھیجا گیا تھا۔ (ان سطور کی تسوید تک یہ وہاں شائع نہیں ہوا)۔

(۱)

عابد صاحب اپنے (حالیہ) مقالہ کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں:۔

صدرِ مملکت جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب بار بار یہ فرما چکے ہیں کہ ان کا مقصد جمہوریت

کو بحال کرنا ہے اور وہ مناسب انداز سے جمہوریت کی بحالی کا وعدہ ضرور پورا کر دکھائیں گے۔ اب ایک طرف تو فوجی حکمران ہیں جو جمہوریت کی اہمیت اور ضرورت کے قائل ہیں اور دوسری طرف وہ دانشور ہیں جو صدرِ مملکت کو مشورہ دیتے رہتے ہیں کہ اسلام کے جمہوری نظام کے نام پر آمرانہ نظام قائم کریں۔

پرویز صاحب کے خلاف مغالطہ آفرینی (جھوٹے پروپیگنڈا) کی یہ دیسی کوشش ہے جس کا ہدف وہ تیس چالیس سال سے بنتے چلے آرہے ہیں ــــ "وہ منکرِ حدیث ہیں۔ منکرِ سنتِ رسول اللہؐ ہیں۔ تین نمازوں اور نوروزوں کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں کہ نماز اردو زبان میں پڑھنی چاہیئے۔ وقس علیٰ ہذا" ــــ حالانکہ وہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں کہتے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی اب عابد صاحب نے وضع کر دی کہ وہ جمہوریت کے مقابلہ میں آمریت کو ترجیح دیتے ہیں۔

گذشتہ کچھ عرصہ سے "اسلام کے سیاسی نظام" کے موضوع پر اخبارات میں مضامین کا ایک سلسلہ جاری ہے۔ اس میں اکثر و بیشتر یہ دیکھا گیا ہے کہ یہ حضرات مغربی جمہوریت کو (اس کے تضمنات کے ساتھ) آسمان سے نازل شدہ نظام سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی بات کہی جائے جو اس نظام، یا اس کے کسی جزو کے خلاف ہو تو دہائی مچا دی جاتی ہے کہ یہ آمریت (ڈکٹیٹرشپ) ہے جو کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں۔ اگر وہ قرآن کی آیت ہے تو اوّل تو یہ کہا جائے گا کہ اس کی ایسی تاویل کی جائے جو مغرب کے جمہوری نظام کی تائید کرے۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر قرآنی آیات کی تلاوت سے ثواب حاصل کر لیا جائے۔ نظام وہی مغربی جمہوری قائم کیا جائے۔ یہی انداز عابد صاحب نے اختیار فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:-

> سوال یہ ہے کہ جب آپ ایسا سیاسی نظام قائم کریں گے جس میں سیاسی جماعتوں کی اجازت نہیں ہوگی تو ظاہر ہے کہ حزبِ اختلاف بھی نہیں ہوگی تو حزبِ اختلاف کی عدم موجودگی میں حکمران گروہ یا فرد کو غیر محدود اختیارات کا مالک بننے سے کیسے روکا جا سکے گا، اور کون روکے گا۔ جب آپ ایسا قرآنی معاشرہ تجویز کرتے ہیں جس میں نہ سیاسی جماعتوں کی اجازت ہے، نہ مذہبی فرقوں کو اپنا وجود برقرار رکھنے کا حق ہے۔ تو پھر اس معاشرہ میں حکمران گروہ کے علاوہ باقی کون رہ جائے گا۔ آپ کہیں گے کہ حکمران فرد یا گروہ قوانین خداوندی کے مطابق حکمرانی کریگا۔ مگر قرآنی قوانین تو گنتی کے چند اور محدود ہیں۔ جبکہ ریاست اور حکومت کو بہت سے معاملات میں نئی قانون سازی کرنی پڑے گی اور داخلی اور خارجی پالیسیوں پر چلنا ہوگا۔ یہ سب کچھ جو ہوگا اس پر تنقید کی اجازت نہ ہو اور حکمران گروہ کے مقابلہ میں دوسرے نقطۂ نظر کو منظم اور اجتماعی انداز میں کام کرنے کا حق نہ دیا جائے تو یہ آمریت کے سوا کیا ہے۔ کیا آمریت پر قرآنی لیبل لگانے سے یہ آمریت نہیں رہے گی؟

آپ نے طریقِ استدلال ملاحظہ فرمایا؟ پوچھا یہ نہیں جا رہا کہ قرآنِ مجید کی رُو سے اسلامی نظام یا معاشرہ میں سیاسی جماعتوں کا وجود جائز ہوگا یا نہیں؟ کہا یہ جا رہا ہے کہ اگر سیاسی جماعتیں نہیں ہوں گی تو حزبِ اختلاف نہیں ہوگی۔

حزبِ اختلاف نہیں ہوگی تو حکمران گروہ پر تنقید کون کرے گا۔ اگر کوئی تنقید کرنے والا نہیں ہوگا تو جمہوریت باقی نہیں رہے گی ——— اس لئے سیاسی جماعتوں کا وجود ضرور رہنا چاہیئے۔ یعنی مقصود بالذات مغربی جمہوریت کا قائم رکھنا ہے۔ مقصد یہ نہیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے متعین کیا جائے کہ اسلامی نظامِ حکومت کس قسم کا ہوتا ہے اور اس میں کس بات کی اجازت ہوتی ہے، اور کس کی نہیں ——— یہ ہے آجکل ہماری سوچ کا عمومی انداز!....

اس کے برعکس پرویز صاحب کا مسلک یہ ہے کہ جو بات سامنے آئے اس کے متعلق دیکھا جائے کہ اس باب میں قرآنِ مجید کا ارشاد کیا ہے۔ یہ متعین ہو جانے کے بعد، جو بات اس کے مطابق ہو، اسے قابلِ قبول سمجھا جائے۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔

(۰)

اب آیئے ان سوالات کی طرف جن کے جواب، عابد صاحب نے ہم سے طلب فرمائے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

(۱) پرویز صاحب کے تجویز کردہ قرآنی نظام میں سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی آزادی ہوگی؟

(حضرت! پوچھئے یہ کہ قرآنی نظام میں اس کی آزادی ہوگی یا نہیں؟ پرویز صاحب یا کسی اور کو اس کا حق کیسے حاصل ہے کہ وہ اسلامی نظام کو "تجویز کرے"۔ وہ تو خود خدا کا متعین فرمودہ ہے)۔

(۲) پرویز صاحب کے "قرآنی معاشرہ" کے حکمران، مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو تسلیم کریں گے یا انہیں غیر اسلامی قرار دے کر ان پر پابندی لگا دیں گے؟

(پوچھئے یہ کہ قرآنِ کریم ان فرقوں کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں؟)

(۳) پرویز صاحب کے اسلامی نظام میں جو اولی الامر یا صاحبِ امر، فرد یا افراد کا گروہ ہوگا، اس پر نکتہ چینی کرنے، اس کے خلاف رائے عامہ کو منظم اور بیدار کرنے، ان حکمرانوں کی تبدیلی کے لئے اجتماعی سعی کرنے کی آزادی ہوگی، یا اس کو قرآنی نظام کے خلاف بغاوت کرنے کا نام دے کر تنقید کرنے والوں کو جیلوں میں ڈال دیا جائے گا۔

(اگر عابد صاحب، کم از کم، طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۸۰ء کے لمعات ہی کا بغور مطالعہ فرما لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ قرآنِ مجید کی رُو سے "اولی الامر" کا مفہوم کیا ہے!)

(۴) پرویز صاحب بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کو غیر اسلامی سمجھتے ہیں؟

(۵) پرویز صاحب پارلیمانی جمہوریت کو جسے علمائے دین نے اپنی دستوری سفارشات میں شامل کیا تھا، پسند کرتے ہیں یا اس کے مخالف ہیں؟

(پرویز صاحب دین کے معاملہ میں خدا کی کتاب کو سند سمجھتے ہیں۔ انسانوں کے فیصلوں کو نہیں)

(۶) پرویز صاحب صوبائی خود مختاری کو جسے ۱۹۷۳ء کے آئین میں تسلیم کیا گیا تھا تسلیم کرتے ہیں یا طاقتور مرکز کے حامی ہیں۔

(اُس آئین کی بنیاد بھی قرآن پر نہیں تھی)

ان سوالات کے بعد عابد صاحب لکھتے ہیں کہ "ان سوالات کے جوابات واضح کر دیں گے کہ اولی الامر کے لئے

غیر محدود اختیارات کے حامی ہیں یا نہیں۔ اور اس کے بعد یہ بحث آگے بڑھے گی"۔۔۔ (ہم یہیں واضح کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ ہماری بحث اُسی سے آگے بڑھے گی جو اس کا اعلان کرے کہ اس کے نزدیک ان امور کی سند اور حجت قرآن کریم ہے۔ جو ایسا اعلان نہیں کرتا اس کے ساتھ دین کے معاملات میں ہم بحث میں اُلجھا ہی نہیں کرتے۔ اس سے سیکولرازم کی سطح پہ بات کی جا سکتی ہے۔)

―――――― (٠) ――――――

عابدؔ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اور جو سوالات دریافت فرمائے ہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں اسلامی حکومت کا تصور ہی نہیں۔ انہیں معلوم ہی نہیں کہ اسلامی مملکت یا حکومت ہوتی کیسی ہے! اگر انہیں اس کا علم ہوتا تو وہ اس قسم کے سوالات پوچھتے ہی نہیں۔ بنا بریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ اسلامی حکومت کہتے کسے ہیں۔ جب یہ حقیقت واضح ہو جائے گی تو عابدؔ صاحب کے سوالات کے جوابات خود بخود سامنے آ جائیں گے۔ واضح رہے کہ اسلامی حکومت کا پورا نقشہ سامنے لانے کے لئے بڑی تفصیل کی ضرورت ہوگی جس کی متحمل ایک روزنامہ کی محدود گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہم مختصر الفاظ میں اس کے بنیادی خطوط اور اصولوں ہی کو پیش کر سکیں گے۔ امید ہے ارباب فکر و نظر انہی مختصرات سے حقیقت تک پہنچ جائیں گے۔

(۱) قرآنِ کریم کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ "تکریم انسانیت" ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ۔ (۱۷/۷۰) یعنی ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں احترام اور تکریم کا مستحق ہے۔ اس بنیادی اصول کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم (اور محتاج) بنانے کا حق حاصل نہیں؛ کیونکہ محکومیت میں شرفِ آدمیت (احترامِ انسانیت) باقی نہیں رہتا۔ قرآنِ کریم نے اسے بیّن الفاظ میں واضح کر دیا ہے کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...... (۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔۔۔ خواہ وہ قانون ساز ہو اور خواہ انتظامیہ کا ذمہ دار حتیٰ کہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو۔۔۔ کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ (اللہ کا محکوم کیسے بنا جائے گا اسے آیت کے اگلے ٹکڑے میں بتا دیا گیا ہے جسے بعد میں درج کیا جائے گا)۔

(۲) حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ..... (۱۲/۴۰) "حکومت صرف خدا کے لئے ہے"۔ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (۱۸/۲۶) "وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا"۔

(۳) لیکن خدا کی ذات تو ہمارے قیاس و گمان و وہم و تصور سے بھی ماورا ہے۔ اس کی محکومیت کیسے اختیار کی جائے؛ محکومیت تو کسی محسوس اتھارٹی کی اختیار کی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے اس نے فرما دیا کہ میری

محکومیت میری کتاب کی اطاعت کی رُو سے اختیار کی جا سکتی ہے جو محسوس شکل میں تمہارے پاس موجود ہے۔ کتاب کے معنی ہیں قوانینِ خداوندی جو اس میں درج ہیں۔ غور فرمائیے۔ قانون کی حکمرانی (RULE OF THE LAW) کا نظریہ قرآنِ کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے انسانوں کو دیا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسُول اللہ سے فرمایا: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸) "ان کے امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کر لیا کرو"۔ اور اس کا اعلان (حضورؐ کی لسانِ مبارک سے) ان الفاظ میں کرا دیا کہ: أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا۔ (۶/۱۱۵) "کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم تسلیم کر لوں حالانکہ اس نے تمہاری طرف اپنی واضح کتاب نازل کر دی ہے"۔

اس سے واضح ہو گیا کہ اسلام میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہو گی۔ ہم نے پہلے (آیت ۳/۷۸) میں اس ارشادِ خداوندی کو درج کیا تھا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنا لے۔ اس کے بعد ہے۔ وَلٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ۔ (۳/۷۹) "اسے کہنا یہ چاہیئے کہ آؤ! ہم سب مل کر ربانی بن جائیں اس کتاب کے ذریعے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور اس پر غور و خوض کے بعد اس کی غایت اور مقصد تک پہنچتے ہو"۔

اس سے واضح ہے کہ اسلامی حکومت وہ ہے جس میں حکمرانی خدا کی کتاب کی ہو۔ نہ کہ کسی انسان کی، کفر اور اسلام میں یہی حدِ فاصل ہے۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہیں کو کافر کہا جاتا ہے۔

یہ ہے اسلامی اور غیر اسلامی حکومت کا معیار اور مدار۔ اور دونوں میں تفریق و تمیز۔

(۰)

لیکن قرآنِ کریم کی صورت یہ ہے کہ اس میں ایسے احکام، جن کی جزئیات بھی اس نے خود ہی متعین کر دی ہوں بہت کم ہیں۔ باقی سب زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اصول و اقدار ہیں۔ ان کی تفصیلات قرآنِ کریم نے خود متعین نہیں کیں۔ جس کتاب کو قیامت تک، اور تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ حیات بننا تھا اسے ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ یہ اصول و اقدار وہ حدود (BOUNDARY LINES) ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانہ کی اسلامی مملکت، وہ ضوابط اور طریقِ کار وضع کرتی ہے جن کے مطابق اصول و اقدارِ خداوندی بروئے کار لائے جا سکیں۔ یہ اصول و اقدار غیر متبدل ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهِ ..... (۶/۱۱۶)

تیرے رب کے قوانین صدق اور عدل کی بنیادوں پر مکمل ہو گئے۔ اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

لہٰذا، کسی حکومت کو اس کا اختیار نہیں ہو گا کہ ان حدود میں کسی قسم کی تبدیلی یا حک و اضافہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ

نے انہیں مکمل بھی کر دیا ہے اور محفوظ بھی۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ (۱۵/۹) "ہم نے اس کتاب کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔ اس لئے اسے کوئی ضائع بھی نہیں کر سکے گا۔ جو کچھ اس میں کہا گیا ہے وہ بالکل واضح اور روشن ہے۔ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ... (۱۶/۸۹) "ہم نے (اے رسولؐ) تجھ پر یہ ایسی کتاب نازل کی ہے جو اپنے مندرجات کو نہایت وضاحت سے بیان کرتی ہے"۔ لہٰذا وہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کی تاویلوں اور تفسیروں میں اختلاف ہوگا، وہ قرآنی تعلیم سے عدم واقفیت کی دلیل ہے۔ قرآن کی تعلیم واضح اور غیر مبہم ہے۔ اور اس میں کسی قسم کا تضاد نہیں۔ یہ خصوصیت بھی اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہے۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔ (۴/۸۲) "کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے؟ اگر یہ غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بکثرت اختلافات اور تضادات پاتے"۔

یہ ہیں وہ حدود جنہیں محفوظ رکھنا، اُمتِ مسلمہ کا فریضہ قرار دیا گیا۔ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ۔ (۹/۱۱۲) مومنین کی خصوصیت بتائی گئی۔

آپ نے غور فرمایا کہ اسلامی مملکت میں کسی کو حقِ حکومت حاصل ہی نہیں ہوتا۔ اس میں اُمت کا فریضہ حدود اللہ کی نگہداشت اور محافظت ہوتا ہے، اور اربابِ حل و عقد کا فریضہ، احکام و اصولِ اقدارِ خداوندی کے اجراء اور تنفیذ کے لئے طور طریق وضع کرنا۔ انہیں آپ جزئی یا فرعی قوانین ..... (BYE LAWS) کہہ لیجئے۔ وہ یہ فریضہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دیں گے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے جزئی اور فرعی قوانین میں سے کوئی بھی ان اصول و اقدار سے ٹکرائے گا نہیں۔ انہی کی روشنی میں اس حکومت کا داخلی نظم و نسق بھی برقرار رکھا جائے گا، اور بیرونی تعلقات کی پالیسی بھی مرتب کی جائے گی۔ قرآنِ کریم ایسی جامع کتاب ہے کہ زندگی کا کوئی معاملہ ایسا نہیں جس کے لئے اس میں اصولی راہ نمائی موجود نہ ہو۔ اس لئے اس حکومت کو، ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، امورِ مملکت کے سرانجام دینے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ حکومت کے وضع کردہ یہ فرعی قوانین زمانے کے حالات کے مطابق بدلتے رہیں گے لیکن وہ حدود اپنی جگہ مستقل اور غیر متبدل رہیں گی۔ ثبات اور تغیر کے اس حسین امتزاج سے، کاروانِ انسانیت اپنی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں رہے گا۔

قرآنِ کریم کی رُو سے، مملکت کسی خاص گروہ یا جماعت کی وراثت یا ملکیت نہیں ہوتی۔ یہ پوری کی پوری اُمت کو ملتی ہے۔ کیونکہ انہی کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ (۲۴/۵۵)۔ اس لئے حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے، امورِ مملکت، اُمت کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔ اس مشاورت کا سب سے پہلے حکم خود حضور نبی اکرمؐ کو دیا گیا۔ (۳/۱۵۹) اور جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ (۴۲/۳۸) "ان کی مملکت کے امور ان کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے"۔ قرآنِ کریم نے مشاورت کا اصول دیا ہے جو غیر متبدل ہے۔ اس مشاورت کی مشینری خود وضع نہیں کی۔ اسے اُمت کی

صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ یہ تقاضائے حالات، جس قسم کی مشینری مناسب سمجھے وضع کرلے۔ ہمارے ہاں کے دانشور حضرات جو یہ تحقیق کرنے کے لئے خواہ مخواہ مغز کھپا رہے ہیں کہ اسلام کی رُو سے انتخابات کس طرح ہوں گے۔ ووٹرز کی خصوصیات کیا ہوں گی۔ مجلسِ قانون ساز کا نظام پارلیمانی ہوگا یا صدارتی۔ مرکز مضبوط ہوگا یا صوبجاتی خود مختاری ہوگی۔ یہ بے معنی بحثیں ہیں۔ ان امور کو اسلامی مملکت، خود اپنے حالات کے تحت طے کرے گی۔ جو طریق بھی وہ مناسب سمجھے وہ "اسلامی" ہوگا بشرطیکہ وہ قرآن کے کسی اصول (حدود اللہ) سے نہ ٹکرائے۔ مغربی جمہوریت اس لئے خلافِ اسلام ہے کہ اس میں قانون سازی کے غیر محدود اختیارات انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں جو قرآن کی رُو سے شرک ہے۔ قرآنی مشاورت اس لئے اسلامی ہوگی کہ اس میں جملہ امورِ مملکت پر حدود اللہ کا کنٹرول ہوگا۔ یہ ہے بنیادی فرق اسلامی اور غیر اسلامی نظامِ زندگی اور اسلامی مشاورت اور مغربی جمہوریت میں۔

(۰)

اب آیئے سیاسی جماعتوں اور مذہبی فرقوں کے وجود کی طرف۔ قرآن کریم کا منتہائے نگاہ، تمام نوعِ انسان کو ایک عالم گیر برادری کے رشتے میں منسوط کرنا ہے۔ آغازِ کار کے لئے اس نے ایک اُمت کی تشکیل کی جس نے نسل۔ رنگ۔ زبان۔ وطن۔ مذہب وغیرہ کے اختلافات کو ختم کرکے صرف ایمان (آئیڈیالوجی) کی بنیادوں پر ایک برادری کی شکل اختیار کی۔ ارشادِ خداوندی ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (۲/۱۴۳) "اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی اُمت بنایا۔ تمہارا نظام یہ ہوگا کہ تم اقوامِ عالم کے اعمال و کردار کی نگرانی کرو اور تمہارا رسول تمہارے اعمال و کردار کا نگران ہو۔" اس اُمت کے متعلق دوسرے مقام پر ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (۳/۱۰۹) "تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم ان امور کو نافذ کرو جنہیں ضابطۂ خداوندی جائز قرار دیتا ہے اور ان امور پر پابندی عائد کرو جنہیں وہ معیوب ٹھہراتا ہے۔"

اس اُمت سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۳) "تم، تمام کے تمام، اجتماعی طور پر، وحیٔ خداوندی (کتاب اللہ) کو مضبوطی سے تھامے رہو، اور باہمی تفرقہ مت پیدا کرو۔" یعنی تشکیلِ اُمت کے بعد، پہلی چیز جس کی انہیں وارننگ دی گئی، یہ تھی کہ وہ تفرقہ پیدا نہ کریں۔ فرقوں اور پارٹیوں میں نہ بٹ جائیں۔ اس نے فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جانے کو مشرکین کا شیوہ بتایا جب کہا کہ

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔ (۳۰/۳۱-۳۲)

دیکھنا! تم ایمان لانے کے بعد پھر سے مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا

جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور اس طرح فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ گئے۔ پھر ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ (حزب) اس زعم باطل میں مبتلا ہو گیا کہ ہم حق پر ہیں، اور باقی سب باطل پر۔

یہاں اس نے اُمت میں فرقہ بندی اور پارٹی بازی کو شرک قرار دیا ہے۔ دوسری جگہ اسے کفر اور عذاب عظیم کا موجب بتایا ہے۔ فرمایا۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۳/۱۰۴) "اے جماعتِ مومنین! دیکھنا کہ تم بھی کہیں ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے واضح تعلیم خداوندی کے آجانے کے بعد باہمی اختلاف کیا اور فرقوں میں بٹ گئے اس کا نتیجہ بہت بڑی تباہی ہوگا۔" آخر میں کہا کہ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ (۳/۱۰۵) "کیا تم ایمان لانے کے بعد پھر کفر اختیار کر لو گے"۔ یعنی ایمان کی مظہر تو وحدتِ اُمت تھی۔ وہ وحدت نہ رہے تو ایمان باقی نہیں رہتا کفر آجاتا ہے۔ اس نے حضورؐ نبی اکرم سے فرمایا کہ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ..... (۶/۱۶۰) "جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور خود ایک پارٹی بن جائیں، اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں"۔

ہم پوچھتے ہیں اربابِ علم و بصیرت سے کہ کیا قرآن کریم کے ایسے واضح اور بیّن ارشادات کے بعد، ایسا تصوّر بھی کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ، نظام یا حکومت میں، فرقوں اور پارٹیوں کی گنجائش ہے....؟

فرقہ بندی اور اسلام کس طرح ایک دوسرے کی ضد ہیں، قرآن کریم نے اس کی وضاحت ایک عملی مثال سے بھی کر دی۔ مدینہ میں بعض لوگوں نے ایک مسجد تعمیر کی ــــ مسجد کا تعمیر کرنا اجرِ عظیم کا مستوجب قرار دیا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے ان کے اس عمل کو کفر قرار دیا۔ اس مسجد کو جہنم سے تعبیر کیا۔ اور رسول اللہ سے فرمایا کہ تم اس میں قدم تک نہ رکھنا! وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے ایک مسجد اور اس کی تعمیر اس قدر غضبِ خداوندی کا موجب بن گئی؟ وہ بات یہ تھی کہ وہ مسجد ــــ تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ (۹/۱۰۷) "اُمت میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب تھی"ــــ اس لئے کہا کہ وہ مسجد نہیں۔ إِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِن قَبْلُ (۹/۱۰۷) "خدا اور اُس کے رسُول کے خلاف جنگ کرنے والوں کی کمین گاہ تھی"!

ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں ہمیں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم کی ایسی واضح تنبیہات کے علی الرغم اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ فرقوں اور پارٹیوں کی موجودگی میں بھی کوئی معاشرہ یا نظامِ حکومت اسلامی کہلا سکتا ہے تو اس سے ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟ عابد صاحب کے ذہن میں کچھ ایسا نقشہ ہے کہ صدرِ اوّل میں جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تھی تو اس کے ایوانِ پارلیمان میں ایک طرف (حضرت) ابوبکرؓ اور عمرؓ مسندِ اقتدار پر متمکن تھے اور ان کے بالمقابل (حضرت) عثمانؓ اور علیؓ (معاذ اللہ) حزبِ اختلاف کی بنچوں پر براجمان۔ اور ان دونوں پارٹیوں (احزاب) میں وہ کچھ ہوتا تھا جو دنیا کے ایوانات پارلیمان میں آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ اُس میں یہ نقشہ نہیں تھا۔ قرآن کریم نے دو احزاب ہی کا ذکر کیا ہے۔ یعنی حزب اللہ

اور حزب الشیطان (۵۸/۱۹-۲۲) حزب اللہ ایک ہی پارٹی (اُمتِ واحدہ) تھی۔ یہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ۔ (۴۸/۲۹) کی پارٹی تھی۔ اور حزبِ مخالف، ابوجہل اور ابولہب کی پارٹی۔ حزب اللہ کے اندر مختلف احزاب (پارٹیوں) کا تو وہاں تصوّر تک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسلام میں حکومت، (یعنی خدا کی طرف سے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی) پوری کی پوری اُمت کی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی مجلس مشاورت (پارلیمان) بھی اُمتِ واحدہ ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید ان سب کا آئین ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے پر نکتہ چینی نہیں کرتے۔ زیرِ نظر معاملہ پر قرآن کی روشنی میں غور و فکر کرتے ہیں۔ اپنی اپنی آراء کا بلا خوف و خطر اظہار کرتے ہیں۔ اس کے بعد جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ قانونِ شریعت کی شکل میں اُمت پر نافذ ہو جاتا ہے۔ اس میں "اربابِ حکومت" اور عوام میں کوئی تفریق نہیں ہوتی، اس قانون کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے۔ اس میں پرسنل لاز اور پبلک لاز کی بھی تفریق نہیں ہوتی۔ یہ تفریق سیکولر نظامِ حکومت کی پیدا کردہ ہے۔ چونکہ اُمت میں کوئی فرقہ نہیں ہوتا اس لئے "مختلف فرقوں کی اپنی اپنی فقہ" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مرکزی حکومت، انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر، ملک کو مختلف قطعات میں تقسیم کر سکتی ہے۔ مرکز کے نمائندگان جو ان علاقوں میں قوانینِ شریعت کی تنفیذ کے فرائض سرانجام دیں گے انہیں قرآنِ کریم میں اولی الامر کہہ کر پکارا گیا ہے۔ وہاں کے لوگوں کو ان اولی الامر (افسرانِ ماتحت) سے اختلاف و نزاع کا حق حاصل ہوگا، اور اس کے تصفیہ کے لئے معاملہ زیرِ نظر کو مرکزی حکومت کی طرف (REFER) کیا جائے گا۔ مرکز اس کا فیصلہ قرآنِ کریم کی روشنی میں کرے گا۔ ارشادِ خداوندی ہے: وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ۔ (۴۲/۱۰) "اختلافی امور کا فیصلہ کتاب اللہ کی رُو سے کیا جائے گا۔"

یہ ہے سرسری سا نقشہ قرآنِ کریم کی روشنی میں، اسلامی نظامِ حکومت کا۔ جسے پرویز صاحب، برسوں سے انتہائی شرح و بسط کے ساتھ پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ (جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے) اگر کسی کو اس سے اختلاف ہے تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ قرآنِ مجید کی سند سے اس اختلاف کو پیش کرے۔ ہم اس پر غور کریں گے۔

لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ان شرائط و حدود کے مطابق حکومت قائم کرنا ممکن نہیں، تو اس دشواری کا آسان ترین حل یہ ہے کہ آپ اسلامی حکومت کا نام لینا چھوڑ دیں۔ سیدھے طور پر، دنیا کی دیگر مملکتوں کی طرح، سیکولر نظامِ حکومت قائم کر لیں مسئلہ حل ہو جائے گا۔ قرآن کی شرائط اور حدود تو غیر متبدل ہیں۔ وہ ہماری یا کسی اور کی خاطر، اپنے اندر تبدیلی کر کے، مفاہمت کی شکل پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کا فیصلہ ہمیں کرنا ہوگا۔ اگر ہم اسلامی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں تو ایسا قرآنی حدود کے تابع ہی کیا جا سکے گا ——— اگر ہم انہیں ناممکن العمل سمجھتے ہیں یا انہیں اپنے اوپر عائد کرنا نہیں چاہتے تو ہمیں جرأت سے کام لے کر اس کا اعتراف اور اعلان کر دینا چاہیئے۔ یہ ——— منکر مے بودن و ہم رنگِ مستان زیستن ——— کی زندگی تو اسلامی نہیں کہلا سکتی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اصل دشواری، قرآنی حدود و قیود کی نہیں۔ اصل دشواری ہم خود ہیں۔ قرآنی نظام کوئی ریاضی کا فارمولا نہیں کہ کافر و مومن یا فاسق و زاہد، جو چاہے اسے حل کر لے۔ جواب صحیح نکل آئیگا۔ اسلامی نظام، ان انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو سکتا ہے جن کا قلب و دماغ قرآنی سانچے میں ڈھل چکا ہو۔ جو اپنے جذبات اور خواہشات، معتقدات و نظریات کو اس کی حدود کے تابع رکھیں۔ اور جنہیں ان کی خلاف ورزی سے مواخذۂ خداوندی کا خوف ہو۔ اسلامی نظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں قائم ہو سکتا ہے ——— عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد ہے ——— (ایسے لوگ پیدا کس طرح کئے جا سکتے ہیں، قرآن اس کا طریق بھی بتاتا ہے۔ لیکن یہ ایک الگ موضوع ہے) اور یہی ہیں وہ لوگ جن سے عابد صاحب کے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ "سربراہِ مملکت کو مسندِ اقتدار سے الگ کرنے کا اختیار کسے حاصل ہوگا ——— ان لوگوں کو اقتدار تو کسی قسم کا حاصل نہیں ہوگا۔ ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہوں گی۔ یہ خدا سے چاہیں گے کہ ان ذمہ داریوں کو سنبھالنے والا کوئی ان سے بہتر مل جائے تو یہ اس گراں باری کو اس کے کندھوں پر رکھ کر سبکدوش ہو جائیں اور خدا کا شکر ادا کریں۔ ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہم باتیں اسلامی حکومت کی کرتے ہیں اور اس کے چلانے والے ہمارے سامنے اپنے جیسے مسلمان ہوتے ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان سے تو وہ نظام چل نہیں سکے گا تو، بجائے اس کے کہ ہم اپنے آپ کو اس نظام کے چلانے کے اہل بنائیں ہم چاہتے یہ ہیں کہ وہ نظام کچھ ایسا بن جائے جسے ہم (علی حالہٖ رہتے ہوئے) چلا سکیں۔ اسے تو اسلامی نظام نہیں کہا جا سکے گا۔ عام فہم الفاظ میں یوں سمجھئے کہ آپ کو اگر موٹر چلانا ہے تو اس کے لئے موٹر ڈرائیور کی ضرورت ہوگی۔ تانگہ چلانے والا موٹر نہیں چلا سکے گا۔

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

والسلام

(۰)

دِین

اپنی مکمّل، عملی شکل میں عہدِ فاروقیؓ میں قائم ہوا۔
اس کے کچھ عرصہ بعد یہ مذہب میں بدل گیا۔
دِین کی وہ شکل کیا تھی اور یہ مذہب میں کیسے تبدیل ہو گیا؟ اس کی تفصیل پرویز صاحب کی مایۂ ناز کتاب

شاہکارِ رسالتؐ

میں ملے گی۔
قیمت مجلد ۵/- روپے ——— (علاوہ محصولڈاک) ملنے کا پتہ
(۱) مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور (۲) ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلینڈ)
ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
149 SUTTON COURT RD
LONDON E-13 — 9NR.
PHONE 01 — 552-1517

لاہور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (فون 880800)
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
حیات سرجری کلینک نمبر ۲۳ ۔ پیپلز کالونی I
(فون نمبر ۲۲۴۵۵)

کراچی ہر جمعہ کو ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ
بزمِ طلوعِ اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۴ ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی کراچی ۲ ۔ فون نمبر ۲۳۸۸۲۸

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزمِ
طلوعِ اسلام۔ ملحق رہائش گاہ
چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ۔ سول لائنز

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بر مکان۔ آغا
محمد یونس صاحب۔ رفیق لین صدر۔ بالمقابل وی آئی پی
مین گیٹ۔ پشاور سٹیڈیم۔ بارہ روڈ (فون ۷۳۶۰۵)

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام
بمقام ۱۲/۱/بی بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
بر مکان ڈاکٹر رضا محمد خاں۔ نواب علی روڈ

جلال پور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی
میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۶۶۔ لیاقت روڈ

ملتان میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ (فون ۳۱۰۷۱)

لیہ (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ بعد نمازِ مغرب
رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب سرکلر روڈ۔

پنج کسی میں ہر جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بوقت ۳ بجے شام
بمقام مطب حکیم احمد الدین صاحب
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام
(تحصیل کبیر والا ضلع ملتان)

ایبٹ آباد میں ہر اتوار ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
دفتر غلام مصطفےٰ اعوان ایڈووکیٹ

ہنگو میں ہر جمعہ ۵ ۱/۲ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) بر مکان
محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۶۷)

بہاولپور میں (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ
باہتمام ڈاکٹر (ہومیو) محمد اعظم خان صاحب
۱۔ ۸ بجے صبح۔ عثمانی خیراتی شفاخانہ غنی پور
۲۔ ۳ بجے سہ پہر بعد نماز جمعہ بر مکان اعظم منزل۔ مچھلی بازار

کوئٹہ میں (بذریعہ ٹیپ) باقاعدگی سے ہفتہ وار
رابطہ کے لئے:۔
ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر توغی روڈ پر
محترم غلام صابر صاحب سے رجوع فرمائیں